Regd. L. No. 7243 Phone. 80900

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

February 1975

سرمایہ داروں کو وارننگ

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ [illegible] وہ ایک ایسے ہمت شکن
ابلیسی نظام کی رو سے جو [illegible] نہیں
ہوتا عوام کے کمانے سے پیٹنے کی تعلیم پر بک لیا ہاں رہا کرتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے
رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اقتصادیات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں
جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟
اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی
ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ!
ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سیشن میں قائد اعظم کا خطاب)

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ - لاہور
[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان ـــ سالانہ ـــ پندرہ روپے	۸۰۸۰۰	۱½
غیر ممالک ـــ سالانہ ـــ ڈیڑھ پونڈ	خط و کتابت: بنام ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور	ڈیڑھ روپیہ

جلد ۲۸	فروری ۱۹۷۵ء	نمبر ۲

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــ ۲
۲۔ قادیانیت ـــــــــــ ۹
۳۔ اس کا جواب دیجئے ـــــــــــ ۱۶
۴۔ ایک اسلام یہ بھی ہے ـــــــــــ ۱۹
۵۔ نقد و نظر ـــــــــــ ۲۷
۶۔ باب المراسلات ـــــــــــ ۳۰
۷۔ شعلۂ مستور ـــــــــــ ۳۲
۸۔ الموبوبت ـــ (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ـــ ۳۳
۹۔ فکر و احساس کی تربیت گاہیں ـــ (پروفیسر علاؤالدین اختر) ـــ ۴۳
۱۰۔ مجلس مذاکرہ ـــــــــــ ۴۹

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر۔ سراج الحق۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔ پرنٹر۔ محمد حسین۔ مطبع۔ لاہور آرٹ پریس۔ انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

کسی قوم کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ جس بنیاد پر اس کی نوتشکیل مملکت کی عمارت قائم ہوئی ہو، وہ اس کا مفہوم ہی متعین نہ کر سکے اور اس طرح اس کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے اچھالنے اور پھیلانے کا موجب بنتی رہے۔ اس کا انجام ظاہر ہے۔ پہلے وہ بنیاد متزلزل ہوگی اور اس کے بعد ایک دن وہ ساری عمارت نیچے آگرے گی۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر رکھی گئی۔ اور یہ وہ نظریہ ہے جس کے الفاظ کو دہرایا تو مسلسل جا رہا ہے لیکن اس کے متعین مفہوم کو سامنے نہیں آنے دیا جاتا۔ طلوعِ اسلام اس باب میں ۱۹۴۸ء سے (بلکہ یوں کہیے کہ ۱۹۳۸ء سے) برابر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کے قارئین (یا ان میں سے کم از کم کچھ لوگ) یہ کہہ اٹھتے ہوں گے کہ یہ داستان سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے۔ اب اسے کب تک دہرایا جاتا رہے گا۔ اور ہمارا جواب یہ ہے کہ جب تک ہمارے قلم میں سکت اور ہمیں کچھ لکھنے کی فرصت اور مہلت ہے، ہم اسے برابر دہراتے چلے جائیں گے کہ اسے ہم اپنا دینی فریضہ اور ملّی تقاضہ سمجھتے ہیں۔ ایسا کرنے کی ضرورت بالخصوص اس وقت بڑھ گئی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریہ کے خلاف حملوں کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ملک میں کسی اور گوشہ سے اس کی مدافعت میں نہ کچھ کیا جاتا، نہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی اسی قسم کی صورت پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس تلخ حقیقت کے دہرانے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ نوعِ انسان اپنی ابتدائی تمدنی زندگی میں امتِ واحدہ یا ایک قوم تھی۔ اس کے بعد لوگوں کی مفاد پرستیوں کے ٹکراؤ نے ان میں اختلاف پیدا کر دیا۔ شروع میں اس اختلاف اور تفرقہ کی بنیاد خاندانی تفریق تھی۔ اسی نے آگے بڑھ کر نسلی امتیاز کی صورت اختیار کی۔ پھر آبادی بڑھی اور انسان دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے تو مختلف ممالک وجہِ امتیاز بن گئے۔ اسے نظریۂ وطنیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک ملک کے اندر بسنے والے لوگوں کو ایک قوم تصور اور تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ انسانوں کی خودساختہ تفریقات تھیں۔ آسمانی راہنمائی نے یہ اعلان کیا کہ یہ تفریقات باہمی خونریزیوں

اور فساد انگیزیوں کا باعث بنتی رہیں گی۔ اس کرۂ ارض پر امن و آشتی کی فضا اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرے اور یہ شکل انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہے جن کا نظریۂ زندگی ایک ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ وہ جو اس نظریہ کے اشتراک کی بنیاد پر اپنے اندر اجتماعیت پیدا کرے اور دوسرا وہ جو اس کے خلاف روش اختیار کرے۔ قرآن کریم کی رو سے اسے "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس نظریہ کو نوعِ انسان کے سامنے پیش کیا اور اسلامی نظام نے جو حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقائے کرامؓ کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا، اسے عملی پیکر عطا کر دیا۔ یعنی اس سے ایک ایسی امت وجود میں آگئی جس کے افراد میں وجہِ اجتماعیت صرف اس نظریہ کا اشتراک تھا۔ اسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی تمام دنیا کے انسان، بلا لحاظ خون، رنگ، زبان، نسل، وطن، جو اس نظریہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوں، اس امت کے افراد قرار پا گئے اور تمام دیگر انسان دوسری قوم کے افراد۔ یہ دوسری قوم کے افراد رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اختلاف کی بنا پر مختلف قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ لیکن امتِ مسلمہ کے مقابلہ میں یہ سب ایک قوم کے افراد تھے۔

امتِ مسلمہ کا یہ نقشہ کچھ عرصہ تک قائم رہا۔ اور اس کے بعد اگرچہ اس کا نام تو وہی رہا لیکن ان میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے اور یہ بھی مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے الٹ کر پھر حاضر میں آجائیے جہاں آپ کو یہ جگر سوز حقیقت نظر آئے گی کہ دنیا کے مسلمان، مسلمان کہلانے کے باوجود مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کہیں رنگ اور نسل کی بنا پر اور بالعموم اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے بعض دردمندانِ اسلام کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ امت کے ان اختلافات کو مٹا کر مسلمانوں کو پھر سے اسی امتِ واحدہ کی شکل میں متشکل کر دیا جائے جو دین کا مقصود و منتہا اور جو ہماری تاریخ کے دورِ اول میں وجود پذیر ہوئی تھی۔ بعض دانش وروں نے اس کے لئے جستِ اول ہی میں بین الاقوامی حیثیت سے تحریک چلانی چاہی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ دیگر اربابِ بصیرت نے یہ سوچا کہ اس کی ابتدا کسی ایک خطۂ ارض سے کی جائے اور جب اس میں کامیابی ہو جائے تو پھر اس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیں، تاآنکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے تمام مسلمان امتِ واحدہ بن جائیں۔ ان اربابِ بصیرت میں علامہ اقبالؒ کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوستان کے تمام باشندے اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں، وطن کے مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ اس کا اگلا قدم یہ تھا کہ یہ مسلمان جو دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم قرار پاتے ہیں، اس کے مستحق ہیں کہ ان کی الگ آزاد مملکت قائم ہو۔ اس کی عملی شکل یہ قرار پائی کہ سرِدست جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، ان پر مشتمل ان کی الگ آزاد مملکت قائم کر دی جائے جہاں یہ اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس مملکت کا نام پاکستان قرار پایا جو ۱۹۴۷ء میں وجود میں آگئی۔

آپ نے اس مختصر سی روئیداد سے دیکھ لیا ہوگا کہ مملکتِ پاکستان کی بنیاد اس قرآنی نظریہ پر ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں ہو سکتے۔ وہ مختلف قوموں کے افراد ہوتے ہیں اور مسلمانوں

کی الگ مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ اس میں قرآنی منشاء کے مطابق اپنا نظام قائم کر سکیں۔

یہ تھی مملکتِ پاکستان کی بنیاد اور اس کے جداگانہ وجود کی وجہِ جواز۔ لیکن یہاں ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ یہاں آئینی اور دستوری طور پر سب سے پہلے اس بنیاد سے انحراف کیا گیا یعنی پاکستان کی چار دیواری میں بسنے والے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر لیا گیا۔ بالفاظِ دیگر ہم عملاً وہیں رہے جہاں ہم تشکیلِ پاکستان سے پہلے تھے۔ اگرچہ لفظی طور پر ہم دو قومی نظریہ کو مسلسل دہراتے رہے۔ آپ کو اس طوطے کی کہانی تو یاد ہوگی جسے اس کے مالک نے یہ الفاظ رٹا دیئے تھے کہ "شکاری کے پھندے میں مت پھنسنا" وہ دن رات ان الفاظ کو دہراتا رہتا تھا۔ ایک دن کسی شکاری نے پھندہ لگا رکھا تھا، وہ طوطا اڑا اور جھٹ سے اس پھندے میں جا پھنسا۔ وہ پھندے کی رسی کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ الفاظ دہراتے جا رہا تھا کہ "شکاری کے پھندے میں مت پھنسنا۔ شکاری کے پھندے میں مت پھنسنا"۔ یہی حالت یہاں ہماری ہو چکی ہے۔ عملاً یہاں اشتراکِ وطن کی بنیاد پر مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر لیا گیا ہے اور زبان سے ہم "دو قومی نظریہ، دو قومی نظریہ" کے الفاظ دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری اس غلط فہمی یا خود فریبی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت کا آدھا حصہ ایک ہی جھٹکے میں یہ کہتے ہوئے الگ ہو گیا کہ جب قومیت کا مدار وطن کا اشتراک ہے تو ہمارا وطن (مشرقی پاکستان) مغربی پاکستان سے الگ ہے۔ اس لئے ہم ایک الگ قوم ہیں۔ اور اس بنیاد پر الگ مملکت کے حقدار۔

اس جگر سوز حادثہ کے بعد یہی جراثیم مغربی پاکستان میں بھی پھیلائے گئے۔ کہا یہ گیا کہ مغربی پاکستان بھی ایک ملک یا ایک وطن نہیں۔ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان الگ الگ اوطان ہیں۔ لہٰذا یہاں ایک قوم نہیں چار قومیتیں بستی ہیں۔ اس تحریک کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں لیکن اسلام کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی اور مملکتی مصالح کی بنیاد پر۔ اس سے اس تحریک کے حامیوں نے چہرہ بدلا اور اس تصور کو ایک اور نقاب اوڑھا کر آگے بڑھایا۔ یہ نقاب ہے کلچر کا اختلاف۔ کہا یہ گیا کہ پٹھانوں، پنجابیوں، سندھیوں اور بلوچیوں کا اپنا اپنا علاقائی کلچر ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ تمسنے والا تو رہا یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ وہی حکومت جس نے چار قومیتوں کے تصور کی مخالفت کی تھی، علاقائی کلچر کی یہ اسکیم اسی حکومت کی زیرِ سرپرستی اور زیرِ نگرانی پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ علاقائی لوک گیت، علاقائی ڈرامے اور کہانیاں، علاقائی ادب، علاقائی میلے، علاقائی وضع قطع اور تراش خراش کی نمائشیں، یہ سب حکومت کی زیرِ سرپرستی عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ اور کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ یہی علاقائی امتیازات، باہمی تعصب کی بنیادیں کھڑی کر کے چار جداگانہ قومیتوں کے تصور کو تقویت دیتے چلے جا رہے ہیں۔ قائد اعظمؒ نے جب پاکستان کا تصور اور مطالبہ پیش کیا تھا تو اس کی تائید میں (منجملہ دیگر امور) یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کا کلچر، ہندوؤں کے کلچر سے جداگانہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کا کلچر کہا تھا، پٹھانوں، پنجابیوں، سندھیوں، بلوچوں، بنگالیوں کے کلچر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کلچر نامی اگر کوئی چیز ہے جس سے کسی قوم کی شناخت ہوتی ہے تو بھی مسلمانوں کا من حیث القوم کوئی مخصوص کلچر ہے جو غیر مسلموں کے کلچر سے مختلف ہے۔ لیکن جب آپ مسلمانوں کے کلچر کی بجائے پنجابیوں یا سندھیوں وغیرہ کا کلچر کہیں گے تو اس میں اسلامی خصوصیت کا سوال تک پیدا نہیں۔ یہی وہ فریب انگیز تحریک ہے۔

جس کی آڑ لے کر ہندوستان سے اس قسم کی آوازیں ابھر رہی ہیں کہ اگر پنجابیوں کا کلچر الگ ہے تو اس میں مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب کے سب پنجابی یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں مل کر ایک قوم کیوں نہیں قرار پا سکتے۔ امرتسر ٹی۔ وی۔ ہر شام اس دلیل کو مختلف انداز میں آگے بڑھائے چلا جا رہا ہے اور ہم اس زہر کو بلا غل و غش پیئے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ان پر کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ یہ آواز خود ہمارے ہاں سے اٹھی ہے اور اسے حکومت کی زیر سرپرستی آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ صرف آگے ہی نہیں بڑھایا جا رہا، اسے بہت بڑی قومی خدمت قرار دیا جا رہا ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ہماری یہ ثقافتیں (یعنی علاقائی کلچر) ہماری شاندار روایات کے حامل ہیں جنکا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ بہت بڑا فریب ہے جس میں قوم کو مبتلا رکھا جا رہا ہے۔ یاد رکھئے ہماری کوئی روایات نہیں۔ اگر کوئی ہیں تو یہ اس دور کی پیدا کردہ ہیں جب ہماری زندگی اسلامی نہیں رہی تھی۔ روایات سب اسلام کی ہیں اور جو روایت کسی اسلامی نظریہ کے خلاف جاتی ہے وہ ہماری روایت نہیں ہو سکتی۔ ہمارا کلچر اس ادب، آرٹ، موسیقی وغیرہ کی محسوس شکل کا نام ہوگا جو اسلامی اقدار کے مظاہر ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کلچر مختلف علاقوں میں بسنے والے تو ایک طرف، مختلف ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی کلچر تمام مسلمانوں کا مشترکہ کلچر ہوگا۔ اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ جو نظریہ، تصور، طریق، انداز، نظام، مسلمانوں میں کسی نوع کی باہمی تفریق کا موجب ہو وہ کبھی اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔ وہ مسلمانوں کا کلچر نہیں کہلا سکتا۔ علاقائی کلچرز کی جو تحریک اس وقت چلائی جا رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اس مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی بلکہ ہمیں وحدتِ ملت کے اس جنت نگاہ تصور سے دور لے جائے گی جو اسلام کا نصب العین ہے اور جس کی صدائے بازگشت ہمیں اقبالؒ کے الفاظ میں سنائی دی تھی۔ حرفِ برہنہ میں یوں کہئے کہ ہم پھر زمانۂ جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔ یہ کفر کی طرف ارتداد ہوگا۔

آجکل ہمارے ہاں انہی لوگوں کی طرف سے ایک نظر فریب دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ مملکت کی جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ اسی کو وطنیت کہا جاتا ہے۔ یہ تلبیس ہے۔ مملکت کی جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ نہایت ضروری ہے، خود قرآن کریم اس کی تاکید کرتا ہے جب کہتا ہے کہ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ..... " (۸/۶۰) تم اپنی سرحدوں کو پوری پوری قوت کے ساتھ محفوظ رکھو۔ اس آیت میں آگے جو الفاظ ہیں اس نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی مملکت کو یہ خطرہ نظامِ خداوندی کے دشمنوں کی طرف سے لاحق ہوگا جس سے سامانِ حفاظت کی ضرورت لاحق ہوگی لیکن اس میں، اور نظریۂ وطنیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظریۂ وطنیت کے معنی یہ ہیں کہ ان سرحدوں کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں لیکن ان کے اندر بسنے والے مسلمان اور ان کے باہر کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ نظریۂ وطنیت، اسلامی تصورِ ملت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس وقت دنیا میں بسنے والے مسلمان وطنیت کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور اس سے ان کی مختلف مملکتیں وجود میں آ چکی ہیں مثلاً مملکتِ پاکستان کی سرحدوں کے متصل ایک طرف افغانستان کی مملکت ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی مملکت۔ افغانستان کے مسلمان بھی اپنے آپ

کو پاکستانی مسلمانوں سے اسی طرح الگ قوم قرار دیتے ہیں جس طرح بھارت کے باشندے۔ لیکن پاکستان اور افغانستان میں یہ قومی تفریق غیر اسلامی ہے۔ یہ تفریقات اس وقت تک رہیں گی جب تک مسلمانوں کی مملکتوں میں صحیح قرآنی نظام رائج نہیں ہوتا۔ اس نظام کے قیام کے بعد یہ تفریقات خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مختلف علاقوں میں امتِ مسلمہ کی الگ الگ مملکتیں قائم رہیں لیکن ان کی حیثیت کچھ یونہی سمجھئے جیسے ایک مملکت کے مختلف صوبے یا صوبے میں کمشنریاں۔ ہمارے صدرِ اول میں مختلف "ولایات" کی یہی حیثیت تھی۔ ان تفریقات سے امت مختلف قوموں میں نہیں بٹ جائے گی کہ قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہوگا جس سے تمام دنیا کے مسلمان امتِ واحدہ کے افراد قرار پائیں گے۔

بہرحال، بات ہو رہی تھی پاکستان کی، اور ہم کہہ یہ رہے تھے کہ یہاں دو قومی نظریہ کو عملاً منسوخ کیا گیا جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ آدھی مملکت چھن گئی بقیہ آدھی مملکت میں چار قومیتوں کے تصور کو اچھالا گیا۔ اسے بے نقاب آگے بڑھانے میں دقت محسوس ہوئی تو اب اسے علاقائی ثقافتوں کے روپ میں پھیلایا جا رہا ہے اور یہ کچھ خود حکومت کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل کا ایک گوشہ بڑا دلچسپ ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، پاکستان کے اندر بسنے والے مخالفوں کی طرف سے انتہائی کوشش ہوتی رہی اور ہو رہی ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی شخصیتوں کے نقوش کو اس طرح دھندلا دیا جائے کہ وہ آنے والی نسلوں کے ذہن میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ کر سکیں۔ بایں ہمہ ملک میں علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات اور قائداعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریبات منائی جاتی رہیں۔ کچھ عرصہ سے، آخر الذکر تقریب کو "نیشنلائز" کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ دو تین سال سے لاہور میں خود حکومت کے زیرِ اہتمام قائداعظمؒ کا یومِ پیدائش ہی نہیں پیدائش کا ہفتہ منایا جاتا ہے (اگرچہ امسال وہ ہفتہ تین دنوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ یعنی اس سال یہ تقریب ۳، ۴، ۵ جنوری ۱۹۷۶ء کو سیمنار کی شکل میں اسمبلی ہال لاہور میں منائی گئی ہے)۔ قائداعظمؒ کی طرف منسوب اس تقریب میں کس کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے، اس کی ایک جھلک فیض احمد صاحب فیضؔ کی اس تقریر سے سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۷۶ء کے اجلاس میں فرمائی، اور جو "نوائے وقت" اور "پاکستان ٹائمز" کی ۵ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ ان میں کہا گیا ہے کہ:-

"مسٹر فیض احمد فیضؔ نے قومی تشخص کی تلاش کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو عہدِ مغلیہ کے بعد اپنے تشخص کی تلاش کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ غیر ملکی حکمرانوں کی آمد سے مسلمانوں کا وہ حاکمانہ مقام ختم ہو گیا، جس کی وجہ سے انہیں کسی تشخص کی تلاش کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ قومیت کا پہلا تصور ہند و قومیت کا تھا جس کے اثرات اب تک بھی باقی ہیں۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ تک مسلمانوں میں زیادہ تر یہی تصور رہا۔ جب سامراجی ممالک نے اسلامی دنیا پر قبضہ جمانا شروع کیا تو مسلمانوں میں "پین اسلامزم" کا تصور ابھرا جس کے معنی یہ تھے کہ

دنیا کے تمام مسلمان ایک امت کے افراد ہیں اس لئے وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد کچھ اور۔ اس تحریک نے قومی آزادیوں کی نمود کو کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔ لوگ اپنے مسائل کے متعلق سوچنے کی بجائے اِدھر اُدھر بھٹک کر رہ گئے۔ اور ایسے تصورات میں الجھ گئے جو انہیں کسی منزل تک نہ لیجا سکے۔ حبِ وطن اور قوم پرستی وغیرہ کو اسلام کے خلاف قرار دیا گیا۔" پین اسلامزم" کی تحریک مختصر رہی لیکن اس کے جذباتی اثرات اب تک باقی ہیں۔ برصغیر میں جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو یہ احساس پیدا ہوا کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی ہوگی اور وہ ہندوؤں کے ساتھ اسی حیثیت میں رہیں گے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء (۱۹۳۱ء) میں پاکستان کا تصور پیش کیا اور دو قومی نظریہ نے جنم لیا جو بہت جلد مقبول ہو گیا اور پاکستان بن گیا، اور ایک نئی قوم "پاکستانی قوم" معرضِ وجود میں آئی۔ یہ نئی قوم بلوچی، سندھی، پٹھان پنجابی اور بنگالی قوم کا مجموعہ نہ تھی۔ نہ ہی یہ ہندوستانی مسلمانوں کی قوم تھی بلکہ نئی پاکستانی قوم تھی جس کے مدِمقابل ہندوستانی قوم تھی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس نئی پاکستانی قوم کا تشخص اور ثنائیت کیا ہو۔ اس مقام پر ضروری تھا کہ دو قومی نظریہ کو خیرباد کہہ دیا جاتا۔ تقسیمِ ہند سے دو الگ الگ ملک وجود میں آئے تھے۔ حصولِ پاکستان کے بعد خود قائداعظمؒ کے سامنے بھی دو قومی نظریہ کا تصور باقی نہیں رہا تھا (؟)۔ لیکن کچھ لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت اس نظریہ کو باقی رکھا۔ بہرحال پاکستانی قوم کا تشخص وہی ہے جو قائداعظمؒ نے دیا تھا کہ وہ دھرتی جس کا نام پاکستان ہے، وہاں جو بھی رہتا ہے وہ پاکستانی قوم کا فرد ہے اور یہی دھرتی قومیت ہے۔ لیکن دو تین برس قبل کی حکومتوں نے اس طرف توجہ نہ دی، حالانکہ قومیت کی بنیادیں یہ تین تھیں۔ (۱) سرزمین سے محبت۔ (۲) ثقافت کا صحیح تصور، اور (۳) معاشی زندگی کے بارے میں راستہ کا تعین۔۔۔ بہرحال اب ہم پھر اس منزل پہ آ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔۔۔۔ سرزمین اور فرد کے مرکب کا نام پاکستان ہے اس لئے پہلے تو ہر آدمی کے دل میں اپنے گاؤں اور علاقے کی محبت پیدا کی جائے لیکن ایک دائرے کے اندر رہ کر، اور اس دائرے کے اندر تہذیب و ثقافت اور دوسری علاقائی خصوصیات کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح جو چیز ابھرے گی وہ پاکستان ہوگا۔"

ہم نے اس طویل اقتباس کو بغیر کسی معذرت کے درج کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ کل جب (خاکم بدہن) پاکستان کا یہ بقایا حصہ بھی تباہ ہو جائے تو اس وقت اتنا تو معلوم ہو جائے کہ اس تباہی کی بنیادی اینٹیں کس طرح رکھی گئی تھیں اور کون سے ہاتھوں نے انہیں رکھا تھا۔ طلوعِ اسلام نے ابتداءِ پاکستان ہی میں قوم کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ اور نظریہ پاکستان کو پسِ پشت ڈال دیا تو یہ مملکت باقی نہیں رہ سکے گی۔

کیونکہ اس صورت میں ہندوستان سے کٹ کر ایک الگ مملکت کے وجود کا جواز ہی ختم ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہمارے اس خدشہ کو محسوس حقیقت کی شکل میں سامنے لے آئی۔ اب ہم ایک بار پھر قوم کے سامنے اس تلخ حقیقت کا رکھنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان نظریات کو جو فیض صاحب کی تقریر میں وضاحت سے سامنے آگئے ہیں، اسی طرح عام ہونے دیا گیا تو پاکستان کا یہ بقایا حصہ بھی الگ آزاد مملکت کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکے گا۔ اگر قوم میں ایسے ارباب بصیرت موجود ہیں جن کے دل میں اسلام اور پاکستان کا درد ہے (اور ہمیں یقین ہے کہ ایسے ارباب درد و بصیرت خال خال ہی سہی، ابھی تک قوم میں باقی ہیں) تو ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر مل بیٹھ کر سوچیں کہ اس مملکت کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ واضح رہے کہ جن گروہوں کو اس وقت احزاب مخالف کہا جاتا ہے انہیں بھی نہ اس خطرہ کا احساس ہے اور نہ ہی ان کے دل میں ان نظریات کی کوئی اہمیت ہے جو اس مملکت کے قیام کی بنیاد ہیں۔ ان کے پیش نظر بھی صرف حصول اقتدار ہے خواہ وہ کتنے دنوں کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا، ان ارباب بصیرت کو جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان لوگوں کی طرف بھی نہیں دیکھنا چاہیئے۔ انہیں گروہ بندانہ سیاست سے الگ ہٹ کر اس خطرہ کی روک تھام کے لئے کچھ سوچنا چاہیئے۔ خدا کرے کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا بن کر نہ رہ جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ مملکت باقی نہیں رہ سکتی اور ان لوگوں کے عزائم بروئے کار آجائیں گے جو پہلے دن سے قیام پاکستان کے مخالف تھے۔

ایک ملک۔ اس کے اندر بسنے والے تمام مسلمان (لیکن صرف مسلمان) ایک قوم۔ ان کا ایک کلچر، ایک ضابطۂ حیات۔ ایک انداز نگاہ۔ ایک نصب العین (یعنی قرآنی نظام کا قیام)۔ اس کا نام ہے پاکستان۔
اگر با ؤ نرسیدی تمام بولہبی است!

(۰)

"ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت"

پرویز

اس موضوع پر اپنے انداز کی اوّلین تصنیف ہے۔

اعلیٰ درجہ کا ولایتی کاغذ۔ کور دیدہ زیب۔ تین سو سے زاید صفحات۔
فرمائش جلد بھیج دیجئے۔ پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔

قیمت
فی جلد -/۱۲ روپے
محصول ڈاک پیکنگ ۲۵/۱ روپیہ

پتہ۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

قادیانیت

دسمبر کے آخری ہفتہ میں قادیانی حضرات کا ان کے حالیہ مرکز ربوہ میں سالانہ جلسہ ہوا۔ ہمیں ان کے اس جلسہ سے سروکار نہیں، لیکن اس کی روئیداد میں دو دلچسپ باتیں ایسی سامنے آئی ہیں جن کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مادرِ وطن

مثلاً اس میں کہا گیا ہے کہ ان کے امیرِ جماعت (مرزا ناصر احمد) نے اپنے افتتاحی خطاب کے دوران فرمایا کہ:

> آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وطن کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اس ارشاد میں مادرِ وطن بھی شامل ہے سو مادرِ وطن کے قدموں کے نیچے جو جنت ہے ہم اسے چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتے ہیں اور کیوں جائیں۔
> (الفضل مورخہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۴ء)

قطع نظر اس کے کہ مرزا صاحب نے جن روایات کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے محدثین کے نزدیک ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے، انہوں نے جو وطن کو ماں قرار دیا ہے یہ خالصۃً بت پرستانہ نظریہ ہے۔ اصنامیاتِ یونان سے اس کی ابتدا ہوئی اور اس کے بعد یہ یورپ کے مختلف ممالک میں عام ہوا۔ اور انہوں نے وطن کو (MOTHER LAND) کہہ کر پکارا۔ ادھر بھارت میں ہندوؤں نے بھی مختلف دیوتوں [illegible] ماتا (ماں) کہہ کے پکارا۔ (انہی میں "گنگا ماتا" اور "بھارت ماتا" بھی شامل ہیں) تقسیمِ ہند کی تجویز کے خلاف مسٹر گاندھی اور [illegible] گوپال اچاریہ جیسے لیڈروں نے سب سے بڑا اعتراض یہی کیا تھا کہ اس سے "ہماری ماتا کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ [illegible] اسے ہم کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتے" مرزا ناصر احمد صاحب نے بھی غالباً وہیں سے یہ تصور لیا اور پاکستان کو "مادرِ وطن" کہہ کر اس کے پاؤں کے نیچے جنت رکھ دی۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر جنت سرزمینِ پاکستان کے نیچے ہے تو ہندوستان کی سرزمین کے نیچے کیا ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ قادیان ہندوستان میں واقع ہے۔ اور وہاں کے مشہور قبرستان (جس میں مرزا غلام احمد دفن ہیں) کو یہ حضرات "جنت البقیع" اور "بہشتی مقبرہ" قرار دیتے ہیں۔ شاید اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہندوستان کے باشندوں کے لئے بھارت ان کی ماں ہے اور اس کے قدموں کے نیچے ان کی جنت ہے۔ یہاں ہماری [illegible] پاکستان ہے۔ اور ہمارے لئے یہاں کی زمین کے نیچے جنت ہے۔ یعنی جتنی مائیں اتنی جنتیں!

۲۔ وحی کا دروازہ کھلا ہے

اس جلسہ میں "مولانا شیخ مبارک احمد صاحب سابق رئیس التبلیغ مشرقی افریقہ" نے "زندہ خدا اور سلسلۂ وحی والہام" کے موضوع پر تقریر فرمائی جس میں یہ نکتہ ارشاد فرمایا کہ اسلام کا خدا زندہ خدا ہے اور زندہ کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ بولتا ہے "مسلمان" خدا کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ مردہ خدا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس نے قرآن مجید کے بعد بولنا بند کر دیا ہے..... اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ:

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور وحی کے ذریعہ ہی صحابہؓ کو تسلی دی اور ان کے ہموم وغموم کو دور کیا۔ چاروں خلفاء کو بھی اس نعمت سے نوازا گیا۔ ان کے بعد امت مسلمہ میں ہزاروں اولیاء، صلحاء اور مجددین ایسے ہوئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وحی والہام کے شرف سے مشرف فرمایا اور انہیں اپنے کلام سے نوازا۔ پھر یہ صرف سلسلہ اسلام کے پہلے دور میں جاری رہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس زمانہ کو بھی اس نعمت سے محروم نہیں رکھا۔ اسلام کی تاثیرات جیسے پہلے تھیں اب بھی ہیں۔

محترم مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر اسلام کے کئی اولیاء، صلحاء، محدثین، اور مجددین کے الہامات بیان کئے۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی زندگی کے ثبوت کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے۔ آپ نے "تذکرہ" سے حضور کے بعض الہامات اور پھر خلفاء مسیح موعودؑ بعض صحابہ اور صحابیات مسیح موعود کے الہامات اور رؤیا وکشوف بھی بیان کئے اور بتایا کہ اسلام کی تاثیرات اب بھی موجود ہیں۔ اب بھی اس کی برکات سے حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اب بھی وحی والہام کے ذریعہ معصیت، گناہ، بدگمانیوں اور بدظنیوں سے نجات پاکر انسان لذت ایمان سے سرشار ہوتا ہے۔

اس میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ پہلے یہ کہ اگر خدا کے زندہ ہونے کا ثبوت اس کی ہمکلامی ہے تو پھر وہ اچھے لوگوں کا خدا ہو سکتا ہے جن کے ساتھ وہ (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) ہم کلام ہوتا ہے۔ انکے علاوہ دنیا کے کروڑوں، اربوں انسانوں کے نزدیک تو وہ زندہ خدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ان کے ساتھ کلام نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ ان صاحب نے کہا ہے کہ "رسول اللہ کے وصال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور وحی کے ذریعہ ہی صحابہ کو تسلی دی اور ان کے ہموم وغموم کو دور کیا۔ چاروں خلفاء کو بھی اس نعمت سے نوازا گیا۔" صحابہ کبار یا خلفائے راشدین میں سے کسی نے بھی یہ دعوےٰ نہیں کیا تھا کہ خدا نے انہیں وحی کے ذریعے تسلی دی تھی اور انہیں اس نعمت سے نوازا گیا تھا۔ ان کے متعلق ایسا کہنا افترا ہے۔ (اولیاء اور صوفیاء حضرات کے متعلق الگ لکھا جا رہا ہے)

اور تیسرے یہ کہ انہوں نے کہا ہے کہ "اب بھی وحی والہام کے ذریعے انسان معصیت، گناہ، بدگمانیوں، اور بدظنیوں سے نجات پاسکتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو وحی اور الہام نہیں ہوتا، ان بیچاروں کے لئے نجات پانے کی کیا شکل ہے؟

ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ جب ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہو رہا ہوتا ہے۔ اور یہ ہمکلامی جو شخص بھی چاہے (قرآن مجید پڑھنے سے) حاصل کر سکتا ہے۔ خدا نے اس کرۂ ارض کے انسانوں سے جو باتیں کرنی تھیں وہ سب قرآن مجید میں کر لیں اور کہہ دیا کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ (۶/۱۱۶) خدا کی باتیں جو اس نے اس زمین پر بسنے والے انسانوں سے کرنی تھیں وہ اس قرآن میں اتمام تک پہنچ گئیں۔ یعنی ختم ہو گئی ہیں۔ اب خدا کو ضرورت ہی نہیں رہی کہ وہ اس دنیا کے لوگوں سے باتیں کرے۔ بلاضرورت باتیں کرنے والوں کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے خدا اس سے بہت بلند ہے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں سے قیامت تک جو باتیں خدا نے کرنی تھیں وہ اس قرآن میں مکمل ہو گئیں تو اس کی سند یہ ہے کہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے خدا کا کلام اور ہدایت ہے۔ یہ کائنات ہمارے کرۂ ارض تک ہی محدود نہیں۔ خدا کی کائنات میں اس کرۂ ارض کی حیثیت وسیع و عریض صحرا میں ایک ذرہ سے بھی زیادہ نہیں۔ کیا معلوم اس کائنات میں کس کس قسم کی مخلوق ہے اور خدا ان سے کس کس انداز سے باتیں کر رہا ہے۔

علاوہ ازیں خدا کے زندہ (حیّ و قیوم) ہونے کی ایک یہی دلیل نہیں کہ وہ باتیں کرتا ہے۔ اس کے لئے اصحابِ بصیرت کے نزدیک بے شمار دلائل ہیں جو خود قرآن کریم میں بھی بیان ہوتے ہیں۔ کلام تو ان میں سے صرف ایک دلیل ہے۔

———— (۸) ————

۳۔ جہاد کی تنسیخ

مرزا غلام احمد کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جہاد " جیسے حکم خداوندی کو نہ صرف منسوخ قرار دیا بلکہ اسے حرام ٹھہرا دیا۔ اس اعتراض کا ان حضرات سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ اب دیکھیے کہ اس کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے۔ اسی سالانہ جلسہ میں' مولانا ابو العطاء صاحب نے "مسئلہ جہاد از روئے اسلام (مع شرائط بزرگانِ سلف) کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ اس سلسلہ میں، الفضل بابت ۲۸ دسمبر ۱۹۷۴ء میں حسب ذیل روئیداد شائع ہوئی ہے:۔

"محترم مولانا نے قرآن و حدیث، ائمہ لغت، مفسرین اور بزرگانِ سلف کے اقوال پیش کرنے کے بعد بتایا کہ جہاد کی مختلف اقسام ہیں۔ (۱) جہادِ اکبر۔ یعنی اپنے نفس کی اصلاح کی پوری کوشش کرنا۔ یہ سب سے مقدم اور اعلیٰ جہاد ہے۔ (۲) جہادِ کبیر۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے پورا زور لگانا اور خود دین سیکھنا اور اوروں کو سکھانا۔ (۳) جہادِ اصغر دشمن

کے مقابلہ میں جنگ و قتال۔ یعنی جب معاندینِ اسلام تلوار اور طاقت کے ذریعہ اسلام کو نیست و نابود کرنے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے برسرِپیکار ہوں تو اس وقت دفاع کرنا اسلامی شریعت میں جہادِ اصغر کہلاتا ہے۔

پہلی دو قسم کے جہاد قیامت تک واجب اور ضروری ہیں لیکن جہادِ اصغر کے لئے بعض شرائط مقرر ہیں۔ مثلاً (۱) مسلمان مظلوم ہوں۔ (۲) قیام امن کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہوں۔ (۳) دشمن نے جارحانہ حملہ میں ابتدا کی ہو (۴) مسلمانوں کا نظام اور ایک واجب الاطاعت امام ہو۔ (۵) مسلمانوں کے پاس ضروری اسلحہ اور کافی لشکر موجود ہو۔ (۶) مسلمانوں کی کوئی جائے پناہ اور ملک موجود ہو۔

مولانا موصوف نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ مذہبی آزادی تھی، ملک میں امن و امان قائم تھا۔ اس لئے تمام مسلمان فرقے اور مذہبی و سیاسی راہنما انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرنے کے خلاف تھے۔ سب کے نزدیک اس وقت جہاد کی شرائط موجود نہیں تھیں۔ یہی موقف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تھا کہ جب تک شرعی شرائط متحقق نہ ہوں جہاد بالسیف جائز نہیں۔ جماعت احمدیہ کے نزدیک جہاد کے التواء کا حکم وقتی اور عارضی ہے جب کبھی دشمنانِ دینِ اسلام کو مٹانے کے لئے تشدد اور قوت سے کام لیں گے، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے برسرِپیکار ہوں گے قرآن و حدیث کی عاید کردہ شرائط کے ماتحت پھر جہاد بالسیف ضروری ہوگا۔ جماعت احمدیہ اس کا ایک نمونہ ۱۹۶۵ء میں پیش کر چکی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ بیان کیا کہا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ مرزا صاحب نے دیگر علماء کی طرح کہا یہ تھا کہ جب تک شرعی شرائط متحقق نہ ہوں، جہاد بالسیف جائز نہیں۔ لہٰذا جہاد کے التوا کا حکم وقتی اور عارضی تھا۔

اس کے بعد آپ یہ دیکھئے کہ جہاد کے متعلق مرزا صاحب نے کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدائے تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیرخوار بچے بھی قتل کئے جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبیؐ کے وقت میں بچوں اور بڈھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لئے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا۔ اور مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔

(اربعین نمبر ۴ ص ۱۵، حاشیہ)

آپ ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ "پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا"۔ اور اسکے

بعد جو کچھ ابوالعطاء صاحب نے فرمایا ہے اسے سامنے لائیے اور دیکھئے کہ ان دونوں میں کس قدر تضاد ہے!

اور آگے بڑھئے۔ مرزا غلام احمد نے اس سلسلہ میں یہ بھی فرمایا تھا کہ۔

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائینگے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۷)

اس کے ساتھ ہی اس نظم کو بھی دیکھئے جس میں مرزا صاحب نے جہاد کے متعلق کہا ہے۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(تبلیغ رسالت جلد نہم صفحہ ۴۹)

مرزا غلام احمد کے ان حتمی اور قطعی اعلانات کو دیکھئے (جو بقول ان کے، خدا کے حکم سے کئے گئے تھے) اور اس کے بعد مولانا ابوالعطاء صاحب کے ان الفاظ پر نگاہ ڈالئے کہ "مرزا صاحب کا موقف یہ تھا کہ جب تک شرعی شرائط متحقق نہ ہو جہاد بالسیف جائز نہیں اور جماعت احمدیہ کے نزدیک جہاد کے بالتلوار کا حکم وقتی اور عارضی ہے"؟ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ حضرات خود اپنے مقتدا کی تعلیم کے بارے میں کس قدر غلط بیانیوں سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابوالعطاء صاحب نے یہ تقریر (الفضل کے بیان کے مطابق) ہزاروں "احمدیوں" کے سامنے فرمائی (ربوہ/قادیان کے خلیفہ صاحب بھی وہاں موجود ہوں۔ اور اگر وہ وہاں اس وقت موجود نہیں تھے تو اس کے بعد یہ چیز ان کے علم میں یقیناً آگئی ہو گی)۔ نہ ابوالعطاء صاحب کو اس قسم کے صریح جھوٹ میں کوئی باک محسوس ہوا اور نہ ہی ان کی جماعت میں سے کسی ایک نے بھی ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ ہے ان حضرات کا مذہب!

(۰)

احمدیوں کا تیسرا فرقہ

ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ احمدیوں کے صرف دو ہی فرقے ہیں — قادیانی (جن کا اب مرکز ربوہ ہے) اور لاہوری۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کا ایک تیسرا فرقہ بھی ہے یعنی "ظہوری"۔ یہ اس طرح معلوم ہوا کہ ہمیں حال ہی میں ایک پمفلٹ موصول ہوا جس کا عنوان ہے "تاریخ احمدیت کا ایک اہم ورق"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے زمانے میں ایک صاحب تھے مولانا ظہیر الدین جو قادیانی رسالہ "الحکم" میں نائب مدیر اور

مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ایک نہایت جوشیلے اور سرگرم احمدی نوجوان متصور ہوتے تھے۔ اس کے بعد خود ظہیر الدین صاحب پر بھی وحی نازل ہونا شروع ہو گئی جس میں خدا نے ان سے کہا کہ:

"تو یوسف ہے اور یوسف کی طرح اپنے بھائیوں پر غلبہ پائیگا۔"

ازاں بعد ان میں اختلاف پیدا ہوا اور ظہیر صاحب نے قادیانی اور لاہوری دونوں جماعتوں سے الگ ہو کر اپنا فرقہ قائم کر لیا۔ یہ صاحب ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں "اروپ" کے رہنے والے تھے۔ اس نسبت سے یہ فرقہ "اروپی" کہلایا۔ ہم نے اس فرقہ کے موجودہ سربراہ ــ رحمت اللہ اروپی صاحب سے ان کے عقاید کی کچھ تفصیلات طلب کیں تو انہوں نے اپنا ایک مختصر سا پمفلٹ بھیجا۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ خدا کی طرف سے نازل کردہ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں جس نے "اس جدید تشکیل شریعت اور جدید ما انزل اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا وہی مسلمان کہلایا۔" اس کے بعد انہوں نے کہا ہے کہ:

اس بنا پر ہم اس زمانہ کے ہادی و منجی حضرت احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہر شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا، وہ مسلمان نہیں ہے۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی سی بات پر یہ الگ فرقہ کیوں بن گیا۔ یہ عقیدہ تو دوسرے احمدیوں کا بھی ہے کہ مرزا صاحب ایک جدید شریعت اور جدید ما انزل اللہ کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور جس نے انہیں قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی حالیہ تصنیف "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں ملے گی)۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس اختلاف کی وجوہات کچھ اور ہوں گی۔

لیکن ہمیں ان لوگوں کے باہمی تنازعات سے کیا سروکار۔ ہم نے تو اس تیسرے فرقے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ ہماری معلومات میں اضافہ تھا۔ اور ہم نے مناسب سمجھا کہ طلوع اسلام کے قارئین بھی اس میں شریک ہو جائیں۔

ضمناً رحمت اللہ اروپی صاحب نے اپنے پمفلٹ میں طلوع اسلام کا ایک اقتباس دیا ہے جس سے عوام کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ طلوع اسلام کے ایک شذرہ میں کہا گیا تھا ختم نبوت کے بعد خدا سے براہ راست علم ملنے کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی اکرم صلعم کے بعد اس ذریعۂ علم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ جو علم خدا کی طرف سے براہ راست دیا جاتا مقصود تھا وہ قرآن کریم کے اندر مکمل اور محفوظ کر دیا گیا اور اس کے بعد کہہ دیا کہ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم نہیں دیا جائے گا۔ اب انسانی علم کا وہی عام طریق ہے۔ یعنی حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات۔ اور غور و فکر کے ذریعہ اخذ کردہ نتائج۔

(پمفلٹ صفحہ ۳)

اروپی صاحب نے طلوع اسلام کا اتنا اقتباس درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "اس زمانہ میں وحی الٰہی کی

راہ نمائی کے بجائے علم انسانی سے موجودہ زمانے کے مسائل کے حل کا مندرجہ بالا اجتہادی اور استدلالی طریق کار ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا کہ درد قولنج کے مریض کے لئے ملیریا کا انجکشن تجویز کرنا۔

ہم اردبی صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ دعویٰ تو ان کا یہ ہے کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی یا الہام ہوتا ہے۔ لیکن ان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں (اور اگر معلوم ہے تو اسے دانستہ چھپایا گیا ہے کہ) انسانی راہ نمائی کے متعلق طلوع اسلام کا عقیدہ اور مسلک کیا ہے۔ ہم ان سینکڑوں مقامات سے صرف نظر کر کے جن میں اس عقیدہ کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پرویز صاحب کی حالیہ تصنیف (ختم نبوت اور تحریک احمدیت) کے ایک مختصر سے اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ۔

> اسے پھر سمجھیے کہ ختم نبوت یا ختم وحی کے معنے یہ نہیں کہ اب انسانوں کو وحی کی ضرورت نہیں رہی اور اب یہ اپنے تمام معاملات اپنی عقل و فکر کی رو سے طے کر سکتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ انسان ہمیشہ وحی کی راہ نمائی کے محتاج رہیں گے۔ ان کی عقل و فکر وحی کی مقررکردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کارفرما ہوگی۔ یہ وحی قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور چونکہ وہ مکمل ہے اس لئے مزید وحی کی ضرورت نہیں رہی۔
>
> (صفحہ ۷۴ - ۷۸)

بکلہ سمجھیے اردبی صاحب ! حیرت ہے کہ اس قسم کے حضرات کا کاروبار مغالطہ آفرینی اور فریب کاری کے سر پر ہی چلتا ہے۔

طلوع اسلام کے متعلق شکایات

• طلوع اسلام کی کتابت اچھی نہیں رہی۔ اس کی طباعت کا معیار گر گیا ہے۔ اس کے صفحے الٹ پلٹ لگ جاتے ہیں۔ رسالہ پہنچتا نہیں۔ یہ اور اسی قسم کی عام شکایات ہم تک پہنچتی ہیں۔ شکایت کرنے والے دوستوں کی شکایات بجا اور درست، لیکن جو ہم پر بیت رہی ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ملک میں لیبر، کاروباری حلقہ، عام نظم و نسق میں جس قدر ابتری پھیل رہی ہے اس کا شکار ہم بھی ہو رہے ہیں۔ یہ تو ایک مشن کی لگن ہے جو ہم ان مشکلات کو برداشت کئے جا رہے ہیں ورنہ طلوع اسلام کے جاری رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اپنی طرف سے ہم ان شکایات کے ازالہ کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں لیکن احباب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس بیراف وقتہ نہ بپا کریں۔ ہماری مجبوریوں کے پیش نظر ہم سے تعاون کیا کریں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

اس کا جواب دیجئے

پرویز صاحب ایک مدت سے کہتے چلے آ رہے ہیں، اور اس حقیقت کو انہوں نے اپنی حالیہ تصنیف "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں زیادہ جامع انداز سے پیش کیا ہے کہ ختم نبوت کی فکر کو اس غیر قرآنی عقیدہ نے توڑا کہ رسول اللہ کے بعد اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کشف والہام کے ذریعے خدا سے براہ راست علم حاصل کرتے ہیں۔ یہی عقیدہ وحی کے اجرار کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے اور اسی کو مرزا غلام احمد نے اپنے بنیادی دعوے کے لئے بطور دلیل، سند اور حجت پیش کیا۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ علمائے شریعت، اور ارباب طریقت دونوں کے ہاں بطور مسلمہ مانا جاتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات اسی نوے سال تک "احمدیوں" کے اعتراضات کا کوئی مسکت جواب نہ دے سکے۔ پرویز صاحب نے بحث کا مدار قرآن خاص پر رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "احمدی" حضرات کی طرف سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑا۔

ہم سابقہ صفحات میں "قادیانیت" کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں کہ احمدیوں کے حالیہ اجلاس میں مبارک احمد نامی ایک صاحب نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا کہ خدائے زندہ رسول اللہ کے بعد بھی اپنے برگزیدہ بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سے اولیاء اور صلحائے امت کے الہامات کو بطور شہادت پیش کیا ہے جن میں امام ابوحنیفہ رح، امام شافعی رح، امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ شریعت بھی شامل ہیں۔ صوفیاء میں سے انہوں نے حضرت بایزید بسطامی رح (جو بقول ان کے ظلی اور بروزی طور پر بایزید محمد کہلاتے تھے اور اس کہنے پر سترمرتبہ کفر کا فتوے ان کے خلاف دیا گیا اور انہیں شہر بدر کیا گیا) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> میں نے اللہ تعالےٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ تیری راہ کیسی ہے۔ فرمایا اپنا آپ چھوڑ اور مجھ تک پہنچ جا..... پھر انہوں نے کہا کہ جب اللہ تعالےٰ نے مجھے تمام موجودات سے اسلغنا کے درجے پر پہنچایا، اپنے نور سے منور کیا، عجائب اور اسرار سے واقف کیا اور اپنی عظمت ظاہر کی تو میں نے اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھا تو خدا کی بخشش مجھ پر ہوئی اور اس نے فرمایا جو چاہتے ہو مانگو۔ میں نے عرض کی، میں تجھے ہی چاہتا ہوں کیونکہ تو سب سے افضل ہے۔ فرمایا جب تو میرا ہے تو میں تیرا ہوں۔ میں نے کہا مجھے اپنے ساتھ ہی مشغول رکھ، غیر اللہ کو میرے سامنے نہ کر۔ تھوڑی دیر تک مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کرامت کا تاج میرے سر پر رکھ کر

فرمایا، سچ کہتا ہے اور سچ کی تلاش کرتا ہے۔

(تذکرۃ الاولیاء، حالات بایزیدؒ)

۲- شیخ عبدالوہاب الشعرانی نے فرمایا:-

اللہ تعالیٰ نے مجھے الہاماً بتایا ہے کہ میں عرش کے چشمہ سے پانی پی رہا ہوں۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کے ان الہامات میں سے جو مجھے ہوتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے ان اہل الہام افراد میں سے بنایا ہے جن پر کثرت سے صحیح الہام ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سائل مجھ سے ایسا سوال کرتا ہے جس کے منقولی جواب سے میں باخبر نہیں ہوتا۔ اس وقت میں خدائے تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے ایسی نقل الہام کرتا ہے جس میں وہ جواب منقول ہوتا ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ جمعہ کس وقت فرض ہوا تھا۔ تو مجھے الہاماً بتایا گیا کہ جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو فرض ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے متعلق مجھے قطعاً کوئی علم نہ تھا۔

(لطائف المنن)

۳- حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے پوچھا گیا کہ آپ نے کب جانا کہ آپ خدا کے ولی ہیں۔ فرمایا میں دس سال کا تھا اور مکتب جایا کرتا تھا تو ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں میری مدد کے لئے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ جواب دیا میں فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں اس وقت تک آپ کے ساتھ رہوں جب تک کہ آپ مکتب میں رہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر! الخ۔ ہم نے اپنی تائید و ثبات تیرے ساتھ کر دی ہے۔ پھر فرمایا اللہ کی قسم میں نے کبھی کوئی چیز نہیں کھائی جب تک مجھے یہ نہ کہا گیا ہو کہ میری ذات کی قسم، تم ایسا کرو۔ اور میں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا جب تک مجھے اس کے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

(قلائد الجواہر)

۴- حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے فرمایا کہ:-

مجھے اللہ تعالیٰ نے الہام سے خبر دی ہے جس کی مجھ سے پہلے خبر نہیں دی گئی اور وہ یہ کہ زمانہ رحلت آنحضرت صلعم کے بعد ایک ہزار اور چند سال گذر کر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ حقیقت محمدی اپنے مقام سے عروج کرے گی اور حقیقت کعبہ سے متحد ہو جائے گی اور اس زمانہ میں حقیقت محمدی حقیقت احمدی کا نام پائے گی اور مظہر ذات احد جل سلطانہ ہو گی۔

(مبدا و معاد۔ تصنیف امام ربانیؒ)

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرف الہام ہوا جس میں انہیں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ۔

ہم نے تجھے اس طریقت کا امام بنا دیا ہے اور تجھے اس کی انتہائی بلندی تک پہنچا
دیا ہے اور ہم نے آج حقیقت قرب تک پہنچنے کے تمام طریق بند کر دیئے ہیں
سوائے ایک طریق کے جو تیری محبت اور اطاعت کا طریق ہے۔

اسی طرح شیخ مبارک احمد صاحب نے خواجہ محمد ناصر، خواجہ میر درد، حضرت سید احمد بریلوی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہ کے الہامات درج کرنے کے بعد مرزا غلام احمد صاحب کے خلفاء مولانا نورالدین اور خلیفہ ثانی مرزا بشیرالدین محمود کے الہامات نقل کئے ہیں اور پوچھا ہے کہ جب ان تمام صلحائے امت نے کشف و الہام کا دعویٰ کیا تھا تو اگر اسی قسم کا دعویٰ مرزا صاحب نے کر دیا تو اس میں کون سی گستاخی کی بات ہوگئی۔ (شیخ مبارک احمد صاحب کی یہ تقریر ربوہ سے شائع ہونے والے اخبار "الفضل" کی ۹، ۱۰ اور ۱۱ جنوری ۱۹۷۵ء کی اشاعتوں میں درج ہے۔)

کیا ختم نبوت کے بعد کشف و الہام پر عقیدہ رکھنے والے حضرات ان کے اس اعتراض کا جواب دیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا سے براہ راست علم پانے کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا۔ اسی کو ختم نبوت کہا جاتا ہے۔ (ان اولیاء کرام اور مرزا غلام احمد کے دعاوی میں کیا فرق ہے؟ اس کی وضاحت پرویز صاحب کے قلم سے آئندہ اشاعت میں کی جائے گی) —— (ختم) ——

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

ایک اسلام یہ بھی ہے!

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی سوانح عمری (بہ عنوان نقشِ حیات) کوئی بیس برس اُدھر (انکی زندگی میں) شائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اب ایک دوست کی وساطت سے اس کی دوسری جلد کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ اس میں دو چار باتیں ایسی ہیں جو بہت کھٹکتی ہیں اور انہی کے اظہار کے لئے ہم نے ان سطور کی تسوید ضروری سمجھی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل تھے۔ اپنے سوانح حیات کی اس جلد میں انہوں نے دیوبند کے اسلاف کے ان کارناموں کا بیشتر ذکر کیا ہے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہادِ حریت اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے متعلق ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے بڑے وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع کی تھی اور اس زمانے کی نمایاں مسلمان ہستیوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو ان کی گرفت میں نہ آئی ہو۔ اس دار و گیر میں انگریزوں نے بڑے تشدد اور استبداد سے کام لیا۔ بہت سے لوگوں نے طرح طرح کے حربوں سے اپنی جان بچائی۔ ان میں دروغ گوئی، فریب کاری وغیرہ سب شامل تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا مدنی نے دیوبند سے متعلق بعض ممتاز علماء اور مشائخ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ انہوں نے بھی سچ جھوٹ سے کام لے کر اپنی مخلصی کرائی۔ اس قسم کی تفصیلات کے بعد وہ ایک شبہ اور اس کا حل کے عنوان سے لکھتے ہیں:-

"وہ ممکن ہے کہ بعض ناظرین کو خلجان ہو کہ اس جگہ اقرار نہ کرنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہ تو کذب اور جھوٹ ہے جو کہ حرام ہے۔ تو اس میں عرض یہ ہے کہ تعریض یعنی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں۔ متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ اور ایسے موقع پر بلاشبہ جائز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے فلسطین کو تشریف لے جا رہے تھے تو ایک کافر جبار کا ملک راستہ میں پڑا جس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی مرد کسی خوبصورت عورت کے ساتھ اس کی سرحد میں سے گزرتا تھا تو عورت کو چھین لیتا تھا۔ اور اگر وہ مرد عورت کا شوہر ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیتا تھا اور اگر بھائی ہوتا تھا تو چھوڑ دیتا تھا۔ مگر عورت ہر حال میں اپنے قبضہ میں کر لیتا تھا۔ اس کے سی۔ آئی۔ ڈی (جاسوسوں) نے

حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی خبر بادشاہ کو پہنچائی۔ اس نے فوراً سپاہیوں کو بھیجا تو آپ نے حضرت سارہ سے کہا کہ تم یہ نہ کہنا کہ یہ میرا شوہر ہے بلکہ کہنا کہ یہ (ابراہیم علیہ السلام) میرا بھائی ہے۔ اس سرزمین پر کوئی ایمان والا سوائے میرے اور تمہارے نہیں ہے (دینی میں تمہارا دینی بھائی ہوں)۔ یہی جواب بادشاہ کے لوگوں کو دیا کہ یہ میری بہن ہے اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ تو یہ جواب جھوٹ اور کذب نہیں تھا بلکہ معاریض میں شمار کیا گیا۔ مخاطبین یعنی بادشاہ اور اس کے لوگ یہ سمجھے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ علیہما السلام آپس میں نسبی بھائی بہن ہیں۔ اس لئے ان کو چھوڑ دیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دینی بھائی بہن ہونے کا ارادہ فرمایا تھا۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ان فی المعاریض مندوحۃ عن الکذب" (یعنی معاریض میں جھوٹ بولنے سے بچاؤ ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ سمجھدار کو کبھی جھوٹ بولنے کی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ ظلم سے بچنے کے لئے معاریض (توریہ یعنی جواب) صرف جائز نہیں بلکہ بسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ اور قسم کھانا بھی درست ہوتا ہے۔ البتہ کسی کے حق تلف کرنے کے لئے ایسا جواب اور قسم درست نہیں۔ یہی طریقہ اکثر سمجھدار دیانت داروں نے پہلے بھی اختیار کیا ہے۔ اور یہی طریقہ حضرت شیخ الہند کے رفقاء حسب ضرورت اختیار کرتے رہے۔

دوسرا حل

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں بُرا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے۔ اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرنا چاہے اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو (جیسے دو لڑنے والوں میں صلح کرا دینا) تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے۔ جیسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس۔ (جو شخص جھوٹ بول کر صلح کرا دے وہ جھوٹا نہیں ہے) حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز (اصلاح والا جھوٹ فتنہ والی سچائی سے بہتر ہے) اسی طرح اپنی بیوی سے ایسا جھوٹ بولنا جس سے محبت میں اضافہ ہو، مباح یا مستحب ہے۔ اس کی تفصیل امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مستصفے الاصول میں اور دوسرے فقہاء احناف و اصولیین نے تحریر فرما دی ہے۔ اس لئے صریح جھوٹ بھی ظالم انگریزوں سے بچاؤ کے لئے کسی طرح ممنوع نہ تھا۔ مالٹا میں مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا (جبکہ بیان لینے والے انگریز کو ہم لوگ جواب دے کر آ گئے تھے اور وہ سازش اور تحریک آزادی کے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں پیش کر کے ہم سے اقرار کرانا چاہتا تھا تو مولانا عزیز گل صاحب کو شبہ تھا) کہ ہم لوگوں نے ناجائز کام کیا تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ (مولانا محمود الحسن) نے جواب دیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں سب کچھ کیا تھا۔ مگر جب انگریزوں نے پوچھا تو سب کا انکار کر کے چلے گئے اور کسی چیز کا اقرار نہ کیا۔ الحاصل یہ شبہ بے علمی

کی وجہ سے ہے۔ یہ جھوٹ ناجائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔"

(نقشِ حیات۔ جلد دوم۔ ص ۲۰۲-۲۰۳)

ایسے مقامات پر ذو معنی باتیں کرنا، جھوٹ بولنا یا دھوکے سے کام لینا اور اس طرح اپنی جان بچا لینا عام لوگوں کا شیوہ ہے اور عصرِ حاضر کی ابلیسی سیاست میں تو گویا یہ ایک مسلّمہ روش سی بن گئی ہے۔ لیکن ایسی باتوں کو شرعاً واجب اور مستحب قرار دینا اور اس کے لئے خدا کے اولوالعزم پیغمبروں کی طرف اس قسم کی اسرائیلیات کو منسوب اور بطور سند پیش کرنا اتنی بڑی جسارت ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب جس واقعہ کو مولانا مدنی نے بیان فرمایا ہے ہمیں معلوم ہے کہ وہ بخاری کی ایک روایت ہے۔ اس روایت میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف یہی ایک جھوٹ منسوب نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ دو اور جھوٹ بھی شامل کر دیئے گئے۔ اب آپ سوچئے کہ جس روایت کی رو سے خدا کے ایک عظیم رسولؑ (حضرت ابراہیمؑ) کو (معاذ اللہ) جھوٹ سے کام لینے والا اور اس کے ایک برگزیدہ رسول (نبی اکرمؐ) کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس جھوٹ کی تائید کرنے والا بتایا گیا ہے، اسے صحیح حدیث کے طور پر پیش کرنا کتنی بڑی جسارت ہے۔ ایک نبی کے دعوائے نبوت کی اولین شہادت یہ ہوتی ہے کہ اس کی زندگی صداقت کا نمونہ ہوتی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ سوچئے کہ اگر خدا کے رسولوں کے متعلق بھی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) جھوٹ سے کام لیتے تھے اور جھوٹ کی تائید کیا کرتے تھے تو ان کے دعوائے نبوت کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان حضرات کو اس قسم کی وضعی روایات کو اپنے کسی قول یا فعل کی سند میں پیش کرتے ہوئے کوئی حجاب نہیں آتا۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے اتنا ہی نہیں کہا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہاں تک کہہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفین کو دھوکے سے قتل کرا دیا کرتے تھے اور صحابہؓ کو اجازت فرما دیتے تھے کہ وہ عند الضرورت جھوٹ سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ (انہوں نے روایات میں بیان کردہ کعب بن اشرف کے قتل کے واقعہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے) انہوں نے یہ کہنے کی بھی جرأت (اور ہمارے نزدیک انتہائی گستاخی) کی ہے کہ حضورؐ نے نبوت کی ابتدائی زندگی میں مساواتِ انسانیہ کے جو بلند اصول بطور تعلیم پیش کئے تھے، جب حکومت ہاتھ میں آئی تو انہیں یہ کہہ کر توڑ دیا کہ خلافت ان کے اپنے قبیلہ قریش ہی میں رہے گی۔ (ان امور پر تفصیلی بحث طلوع اسلام کے صفحات میں متعدد بار آ چکی ہے۔)

اس قسم کی ہیں وہ وضعی روایات جن کے انکار کو یہ حضرات کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس قسم کی روایات کے صحیح ماننے پر اصرار کیوں کرتے ہیں اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ ان روایات کی رو سے یہ لوگ اپنے جھوٹ، فریب اور اصول شکنی کے لئے جواز کی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔

جہاں تک ذو معنی باتیں کرنے کا تعلق ہے، قرآن کریم جماعتِ مومنین کو تاکیدی حکم دیتا ہے کہ

قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا۔ (۴/۹) ہمیشہ صاف، سیدھی، اور دوٹوک بات کرو۔ یہ سورۃ نساء میں شہادت کے ضمن میں کہا ہے۔ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴/۱۳۵) کبھی "تعریضی" بات نہ کرو۔ صاف واضح الفاظ میں، کھلی کھلی بات کرو جس میں نہ کوئی ابہام ہو نہ تلبیس۔ "تعریضی" گفتگو کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے قلب اور زبان (حقیقت اور الفاظ) میں ہم آہنگی نہ ہو۔ اسے قرآن کریم نے سنگین جرم قرار دیا ہے۔ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۳/۱۶۷) علامہ اقبال کے الفاظ میں:۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کو جان کا خوف ہو تو وہ اس وقت کیا کرے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ہمارے سامنے ساحرینِ دربارِ فرعون کی روش کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے فرعون جیسے جابر شہنشاہ کے سامنے ہزارہا لوگوں کے ہجوم میں اعلان کر دیا کہ ہم حضرت موسیٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے گرجتے ہوئے کہا کہ یاد رکھو! میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں الٹی اطراف سے کٹوا دوں گا۔ تمہیں سولی پر ٹانگ دوں گا۔ تمہیں ایسا عذاب دوں گا کہ جس کی مثال کہیں نہ ملے۔ انہوں نے اسے پورے سکون سے سنا اور دل کے انتہائی اطمینان کے ساتھ کہا۔

فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ ۖ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ (۲۰/۷۲)

جو تیرے جی میں آئے کر گذر۔ ہم تجھ سے اس فیصلہ سے منحرف ہو سکتے ہیں، جھوٹ بول کر اپنی جان بچانا چاہتے ہیں ہم نے تیری دھمکی سن لی۔ لیکن تو اس حقیقت کو بھول گیا کہ تیری دسترس کی آخری حد ہماری طبعی زندگی تک ہے۔ اس سے آگے تیرا کوئی اختیار ہی نہیں۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تو ہماری طبعی زندگی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ایمان کی رو سے انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ آگے بھی چلتی ہے اور اس زندگی پر تمہارا کوئی اختیار نہیں۔

یہ ہے ایسے مواقع کے لئے قرآن کریم کی تعلیم۔ اور یہ دیکھ کر آپ متعجب ہوں گے کہ اس کی ایک مثال خود مولانا مدنی نے اپنی اسی کتاب میں بڑے فخر سے پیش کی ہے۔ یہ واقعہ ہے مشہور عالم مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا۔ انہیں بھی انگریزوں نے بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا۔ ان پر سب سے بڑا سنگین الزام یہ تھا کہ انہوں نے اس فتویٰ پر دستخط کئے تھے (بلکہ وہ خود انہی کا لکھا ہوا تھا) جس کی رو سے انگریزوں کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیا گیا تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر عاید کردہ الزامات میں سے ایک ایک کو رد کر دیا۔ خود جج بھی مولانا کی عظمت کا قائل تھا جس مخبر نے مخبری کی تھی اس نے بھی ان کے پہچاننے سے

انکار کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان کی رہائی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن مولانا نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

> پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت سے میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا ہے اور جھوٹ بولا ۔ وہ فتوےٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔
>
> (صفحہ ۲۵۱)

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور علامہ ہر بار یہی کہتے تھے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ صحیح ہے اور مجھے اس کے انجام کا بھی علم ہے چنانچہ عدالت نے مجبور ہو کر حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا جسے آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔

مولانا مدنی نے اس واقعہ کو درج کرنے کے بعد پہلے بطور تبریک و تہنیت یہ شعر لکھا ہے ؎

عقل از بہر رہائی دو کمند کرد اسیر خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

اور اس کے بعد کہا ہے

> • شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہِ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا ہے کہ "شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" (۲۵۳)

مولانا مدنی آج دنیا میں موجود ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے اور اب ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں جو جھوٹ بولنے کو از روئے شریعت فرض اور واجب قرار دیتے ہیں کہ کیا وہ علامہ فضل حق خیر آبادی کو ترکِ فرض اور واجب کا گنہگار قرار دیتے ہیں یا بارگاہِ خداوندی میں شیر کی زندگی جینے والوں کا سا مقامِ بلند پر فائز، مردِ مومن؟

اس سلسلہ میں سب سے بڑا الجھاؤ اس مثال کی رُو سے پیدا کیا جاتا ہے کہ فرض کیجئے کہ ایک شخص کہیں اگر چھپا ہے جس کا علم باہر بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو ہے۔ پیچھے سے ایک شخص بندوق لئے ہوئے اس پہلے شخص کو قتل کرنے کے لئے آ نکلتا ہے اور اس باہر والے شخص سے پوچھتا ہے کہ وہ چھپنے والا شخص کہاں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ شخص سچ بول کر اس کا پتہ بتا دے یا جھوٹ بول کر اس کی جان بچالے۔

اس مثال میں دو شقیں تو یہ لوگ بیان کر دیتے ہیں لیکن تیسری شکل سے عمداً گریز کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ شخص نہ سچ بول کر اسے قتل کرائے نہ اس کی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولے۔ بلکہ یا تو اس کی بابت کا کوئی جواب نہ دے اور یا یہ کہہ دے کہ میں نہیں بتانا چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے سے یا خاموش رہنے سے اسے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ شخص درحقیقت اپنے آپ کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔ اگر یہ شخص خاموش رہتا یا اس کا پتہ نشان بتلانے

انکار کر دیتا تو اس سے اُس شخص کی جان تو بچ جاتی لیکن اُسے خطرات سے دوچار ہونا پڑتا۔ ایسے مقام پر مومن کا شیوہ یہی ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے، فریب کاری سے کام نہ لے بلکہ اپنے آپ کو خطرات میں ڈال کر دوسرے کی جان بچائے۔

اور اگر یہ شخص ایسا کمزور واقع ہوا ہے کہ اپنے آپ کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے جھوٹ بولتا ہے تو اس کے بعد اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب تو نہ دے کہ میں نے جھوٹ بول کر شریعت کی طرف سے عاید کردہ فرض یا واجب کی اطاعت کی ہے۔ عام دنیادار جھوٹ بولتے ہیں تو اسے "کارِ ثواب" قرار نہیں دیتے۔ ان کے مقابلہ میں ہمارے یہ حامیانِ دینِ متین ہیں جو مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ تم جھوٹ بھی بولو اور ثواب بھی کماؤ۔

کیا یہی ہے وہ اسلام جسے ہم دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

(۲)

انہی بزرگوں کے سلسلہ میں مولانا مدنی کچھ اور واقعات بھی بیان فرماتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

وہ (اسی ہنگامہ کا دوسرا واقعہ) تینوں حضرات (حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب، مولانا گنگوہی، مولانا نانوتوی رحمہم اللہ تعالےٰ) کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا ہے اور گرفتار کنندہ کے لئے (انعام) تجویز ہو چکا ہے۔ لوگ تلاش میں ساعی اور جاسوس ان کی ٹوہ میں پھرتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب راؤ عبداللہ خان رئیس پنجلاسہ کے اصطبل خانہ کی ایک اندھیری کوٹھری میں مقیم ہیں۔ چاشت کی نماز کا وقت ہے (یعنی ۹ یا ۱۰ بجے صبح کا) ایک روز اسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلے بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نوافل پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خان اعلیحضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں، گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیحضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے، اس سے قائم ہوتے ہوئے حضرت کے لئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبہ محبت دین اور فرط عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پرواہ تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خان حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں تو سامنے سے پولیس کو آتے دیکھا اور ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا اور کس بلا کا چالاک تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ پولیس اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں گویا اپنے آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ اب بچاؤ کی شکل مشکل ہے، "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن"

اپنی جان یا عزت کے جانے یا ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پہن کر جیل خانہ

پہنچنے یا پھانسی پر چڑھ کر عالمِ آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پرواہ نہ تھی۔ مگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ اپنے غلام کے گھر سے اور آفت گرفتار ہو اور عبداللہ خان کے گھر میں۔ اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جوان مرد مستقل مزاج، نہایت دلیر، قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دابا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی بھی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر کہ میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا۔ اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔

راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لئے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیفِ سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیحضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ "اس کوٹھڑی میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" اس کے پٹ کھول دیئے۔ راؤ عبداللہ خان کی اس وقت جو حالت ہوتی ہوگی وہ انہی کے دل سے پوچھا چاہئے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آ گیا اور پیمانۂ حیات لبریز ہو کر چھلکا چاہتا ہے۔ البتہ راضی برضائے الٰہی ہو کر جی ہاں کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے، تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بھرا ہوا پڑا تھا۔ مگر اعلیحضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران، اور راؤ عبداللہ خان دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار، کبھی اِدھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ آخر مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خان صاحب! یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب بولے جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا۔ آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھڑی۔ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ جواب لاجواب سن کر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو۔ یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا۔ "راؤ صاحب! معاف کیجئے۔ آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا۔" راؤ عبداللہ خان کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوتے تو واپس ہوئے اور کوٹھڑی کھول دی۔ دیکھا کہ اعلیحضرت مسلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔"

(امداد المشتاق۔ صفحہ ۳۰-۲۹، از تذکرۃ الرشید صفحہ ۷۹)

مولانا مدنی نے یہاں حضرت حاجی امداد اللہؒ کی یہ کرامت بیان فرمائی ہے لیکن اسی سے متصل اسی صفحہ پر انہی حاجی صاحب کے متعلق یہ واقعہ بھی درج کیا ہے کہ:

وہ اس قسم کے متعدد واقعات حضرت حاجی صاحب اور مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہم

کے پیش آتے رہے اور باوجود سخت احکام اور مخبروں کی دوا دوش اور خود غرضوں اور دشمنوں کی انتہائی جد وجہد کے تینوں حضرات محفوظ رہے۔ کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ غالباً گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر میں جو کہ اس زمانہ میں ضلع سہارنپور میں تھا ایک رئیس کے یہاں جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے، مقیم تھے، مخبر نے افسر اعلیٰ انگریز کو خبر دی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریز کو حکم لکھا کہ تم فوراً چند سواروں کو لے کر پہنچو۔ چونکہ اس علاقہ کے تھانیدار خواجہ احمد حسن مرحوم سہارنپوری والد ماجد خواجہ اطہر صاحب سہارنپوری ایڈووکیٹ کے والد ماجد تھے اور ان کو حضرت حاجی صاحب سے عقیدت تھی۔ اس لئے یہ تاکید کر دی کہ تھانیدار کو نیچے کی سطریں جن میں موضع اور رئیس کا نام درج تھا مت دکھانا۔ لفظاً اوپر کی سطریں جن میں سپرنٹنڈنٹ کو حکم تلاشی لینے کا اور تھانیدار کو حکم سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جانے کا تھا، دکھلانا۔ اس خوف سے کہ چونکہ تھانیدار ہندوستانی اور مسلمان ہے ممکن ہے کہ فورس کی روانگی سے قبل خفیہ طور سے کہیں اطلاع نہ کر دے، چنانچہ سپرنٹنڈنٹ تھانہ میں پہنچا اور کہا کہ میرے ساتھ فورس لے کر فوراً چلو۔ خواجہ صاحب نے جگہ اور مکان کو پوچھا تو اس نے وہی اوپر کی سطریں دکھلائیں اور نیچے کی سطریں نہیں دکھلائیں اور ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ خواجہ صاحب فورس لے کر ساتھ چل دیئے۔ جب گاؤں میں پہنچے تو سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو فلاں شخص کے مکان پر جانا ہے۔ آواز ان کی بہت بلند تھی۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے سے پہلے بلند آواز سے اس رئیس کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور کہا کہ تو سرکار کا نمک حرام اور باغی ہے۔ ہم تجھ کو یہ کریں گے وہ کریں گے۔ تو باغیوں کو اپنے یہاں رکھتا اور پناہ دیتا ہے۔ یہ آواز اُن کے پہنچنے سے پہلے پہنچ گئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ رات کا وقت تھا۔ مکان پر پہنچے اور دروازہ کھلوایا۔ مردانہ اور زنانہ مکان کی تلاشی لی۔ مکان کا محاصرہ کر لیا، مگر حضرت حاجی صاحب نہ ملے کیونکہ آواز کے پہنچتے ہی حضرت حاجی صاحب کو دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ باوجود شدت تلاشی کے ناکام واپس آئے۔ ایک دوسرے گاؤں میں اسی طرح واقعہ پیش آیا۔ بالکل بے خبری میں دوش پہنچ گئی۔ فوراً حضرت کو ایک رزائی اوڑھا کر مردانہ مکان میں لٹا دیا گیا تھا۔ افسر کو زنانہ مکان کے متعلق زیادہ شبہ تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تمہارے مکان کی تلاشی لوں گا۔ مالک مکان نے کہا کہ حضور چلئے یہاں کوئی مشتبہ چیز یا شخص نہیں ہے۔ اندر لے گیا اور لے جاتے ہوئے اپنے لوگوں سے بآواز بلند کہا کہ اس بڈھے بیمار کو چارپائی سمیت کھیت میں ڈال آؤ۔ اس نے کھانس کھانس کر اور کھنگار نکال نکال کر تمام مکان گندہ کر دیا ہے۔ وہ مکان میں معہ افسر داخل ہوا اور گاؤں والے چارپائی مثل جنازہ اٹھا کر گاؤں کے باہر کھیت میں ڈال آئے۔ حصار کرنے والی پولیس نے سمجھا کہ یہ تو کوئی واقع میں قریب المرگ بیمار ہے۔ تعرض نہ کیا۔ حضرت وہاں جا کر دوسرے مکان میں چلے گئے اور افسر معہ فورس باوجود سخت تفتیش ناکام واپس ہوئے۔ بہرحال فضل خداوندی شامل حال تھا۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آتے رہے۔ مگر ہر جگہ حکومت کو ناکامی ہی رہی اور حضرت حاجی صاحب صحیح وسالم مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ۶۶

سوال یہ ہے کہ اگر حاجی صاحب علیہ الرحمۃ، راؤ عبداللہ خان کے اصطبل کی کوٹھڑی میں سے (ازراہ کرامت) تلاشی کرنے والوں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتے تھے تو وہ اس گاؤں کے مکان سے اسی طرح غائب کیوں نہ ہوئے؟ اس کے لئے اس قسم کا کھیل کیوں کھیلنا پڑا؟

لیکن یہ باتیں ان حضرات سے پوچھے کون؟ جو پوچھے وہ کافر کہلائے۔

(۰)

نقد و نظر

(۱) اَلتُّھْمَۃُ الصَّلِیْقَۃُ (عَلٰی) رُوْحُ الْقُدُسِ وَ مَرْیَمَ الصِّدِّیْقَۃ

(۲) بُھْتَانٌ صَرِیْحٌ (عَلٰی) اَلرُّوْحِ وَمَرْیَمَ وَالْمَسِیْحِ۔

(۳) اُصُوْلُ الْاِسْلَامِ لِاَھْلِ الْاِسْلَامِ۔

"طلوعِ اسلام" بابت جنوری ۱۹۷۵ء میں "مسجدِ اقصیٰ" کے عنوان سے پرویز صاحب ... کا ایک مختصر سا مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مولانا عنایت اللہ اثری، وزیر آبادی ثم گجراتی نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم میں جس مسجدِ اقصیٰ کا ذکر آیا ہے اس سے مراد بیت المقدس نہیں بلکہ مدینہ منورہ ہے جس کی طرف حضورؐ نے ہجرت فرمائی تھی۔ جیسا کہ اس مقالہ میں کہا گیا ہے، مولانا ئے ممدوح جماعت اہلحدیث کے ایک ممتاز عالم ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف سے اس قسم کی ندرت بڑی جرأت طلب تھی جس کے لئے وہ مستحق تہنیت ہیں۔ اب ہمیں (ڈاکٹر) سید سجاد حسین مجیدی، ایم۔ اے، ایم۔ اے (جہلم) کے حسن وساطت سے مولانا صاحب کے کچھ کتابچے اور سورۃ النساء تک کی تفسیر پر مشتمل تصنیف موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین کتابچے زیرِ تبصرہ ہیں۔ یہ تین چار سال پہلے کے شائع شدہ ہیں اور موضوعِ زیرِ بحث ان میں ایک ہی ہے۔ ان میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے نہیں ہوئی تھی۔ حضرت مریمؑ نے باقاعدہ شادی کی تھی اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی عام انسانی بچوں کی طرح پیدا ہوئے تھے۔ اس میں انہوں نے سلف سے خلف تک کے ان دلائل اور اسناد کا جائزہ لیا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کی تردید کی ہے۔ اس سے مولانا صاحب کے علوم شریعت میں تبحر اور وسعتِ معلومات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس جرأت کا بھی جو اہلحدیث ہوتے ہوئے اس قسم کے دینی "مسلّم نظریہ" کی تردید کے لئے درکار تھی۔ سجاد صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا صاحب کی عمر قریب اسی سال کی ہے۔ بنا بریں ان کی تحریر کا انداز اور اسلوبِ بیان وہی ہے جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ہمارے مذہبی حلقوں میں مروج تھا۔ اگر مولانا صاحب کے حلقہ تلامذہ میں کوئی صاحب جدید اسلوبِ نگارش پر دسترس رکھتے ہوں اور وہ خود مولانا صاحب کے زیرِ نگرانی ان کتابچوں کا ملخص سلیس اردو زبان میں، مختصر لیکن جامع طور پر ایک کتاب میں شائع کر دیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی افادی حیثیت بہت بڑھ جائے گی۔

پیدائشِ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں عام اقوال

عام روایات اور تفاسیر کی رو سے عقیدہ یہ ہے کہ بطنِ حضرت مریمؑ میں حضرت عیسیٰؑ کے حمل کا واسطہ جبریلِ امین تھے۔ مولانا صاحب نے اس سلسلہ میں مختلف فرقوں کے معروف اور ممتاز حضرات کے اقوال نقل فرمائے ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک اقوال درج ذیل کرتے ہیں تاکہ قارئین "طلوعِ اسلام" کو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں ہمارے مذہبی پیشواؤں کا عقیدہ کیا ہے۔ مولانا صاحب نے پہلے ان اقوال کا ملخص اس طرح بیان فرمایا ہے۔

> ہمارے ذی علم حضرات کی رو سے بات یوں ہوئی تھی کہ جب حضرت مریمؑ نے حیض سے پاک ہو کر غسل کے لئے پردہ بنایا تھا تو جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے پاس نہایت خوبصورت نوجوان، بے داڑھی مونچھ، گھنگھریالے بال بنا کر آیا اور کہا کہ میں تجھے بچہ دینے آیا ہوں۔ پھر آپ کے ساتھ مجامعت بھی کی جس کا لطف دونوں نے اٹھایا اور اسے حمل بھی ٹھہر گیا اور بچہ بھی پیدا ہوا جو کہ آدھا بشر اور آدھا جبریل زادہ ہے۔" (کتابچہ نمبر ۲۔ صفحہ ۳)

اس اجمال کی تفصیل میں انہوں نے مختلف ائمہ اور علماء کے اقوال درج فرمائے ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ :-

> پھر حضرت مریمؑ کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساتھ جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے۔ جب ان سے پاک ہوتیں تو لوگوں سے ایک الگ مکان میں غسل کرنے کیلئے گئیں اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبریل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریمؑ نے ان کو دیکھا۔ اور خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں۔ ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور میں دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے۔ پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی۔ طبیعت میں قوائے نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے، جیسے کسی کو نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے ...... حضرت جبریلؑ نے جب ان کے حال کو دیکھا تو ان کے سینہ میں پھونک لگا دی۔ اس پھونک سے اس میں اثر پیدا ہوا اور وہ منزل ہو گئیں۔ حضرت مریمؑ کے نطفہ میں مرد کے نطفہ جیسی قوت تھی اس لئے وہ حاملہ ہو گئیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۔۵)

(۲) مولانا سید امیر علی صاحب رامپوری، دیوبندی حنفی نے "مواہب الرحمٰن" میں فرمایا ہے :-

> جبریل علیہ السلام اس وقت خوبصورت آدمی کی صورت میں تھے۔ انہوں نے ان کی قمیص کے چاک گریبان میں پھونک دیا اور مریم کو حمل عیسیٰ علیہ السلام کا ہو گیا۔ (کتابچہ نمبر ۱۔ صفحہ ۳)

(۳) جاء الحق بریلوی کتاب صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے۔

> دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آدھے بشر اور آدھے روح تھے کیونکہ حضرت مریم تو بشر

تھیں اور حضرت جبریل روح۔ (ایضاً صفحہ ۳)

(۴) شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں لکھا ہے کہ:۔

پھر مریم میں شہوت سرایت کی اور مریم کے اصل پانی اور جبریل کے دہمی پانی سے جو اس نفخ کی رطوبت میں آیا تھا، عیسےٰ علیہ السلام کا جسم بنا۔ (ایضاً صفحہ ۴)

(۵) شیعہ مفسر سید علی حائری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:۔

جبریل علیہ السلام کے نفخ نے مریم کو اس طرح حمل ٹھہرایا جس طرح نر مادہ کو حمل ٹھہراتا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۶)

(۶) حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر نیز تاریخ میں فرمایا ہے کہ:۔

جبریل علیہ السلام نے مریم کو اس طرح حمل ٹھہرایا جس طرح شوہر اپنی بیوی کو جماع سے حمل ٹھہرایا کرتا ہے اور جیسے کہ فرزند کی امید پر اس کے ماں باپ جماع کرتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۷)

(۷) نواب صدیق حسن خان مرحوم نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آنے والا — جبریل نہیں تھا بلکہ عیسےٰ علیہ السلام خود ایک کامل انسان کی شکل بن کر حضرت مریم کے سامنے آکھڑا ہوا اور باتیں کرتے کرتے اس کے اندر داخل ہو کر خارج ہوا تو اس کا بیٹا کہلایا۔[1] (ایضاً صفحہ ۱۱)

(۸) مرزا غلام احمد قادیانی نے (مواہب الرحمٰن میں) کہا ہے کہ "اللہ پاک قادر ہے کہ درختوں پر پتوں اور پھلوں کی طرح ایک نہیں کئی ایک عیسےٰ پیدا کر دے، تو اگر ایک عیسیٰ صرف عورت سے پیدا ہوتا ہے تو کیا عجب ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

غرضیکہ مولانا عنایت اللہ صاحب نے اسی قسم کے متعدد اقوال درج کئے ہیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہمارے علمائے کرام دنیا کے سامنے کس قسم کا اسلام پیش کرتے ہیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ فرما دیا ہے قرآن کی صحیح تفسیر وہی ہے۔ اس سے الگ کوئی تفسیر بیان کرنا الحاد اور بے دینی ہے۔ تو ان کی پیش کردہ تفسیر کی حقیقت کیا ہے۔ کیا ہم یہ تفسیریں پیش کر کے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل بھی رہتے ہیں؟

طلوعِ اسلام کا جرم یہی ہے کہ وہ اس قسم کی خرافات کو خدا اور رسولؐ کی طرف منسوب کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اب اس "انکار" کا نام جو کچھ کسی کے جی میں آئے رکھ لے، ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولانا عنایت اللہ صاحب جیسے اہلِ حدیث عالم بھی اس "انکار" میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ حضرت عیسےٰ کی پیدائش (اور وفات) کے سلسلہ میں (قرآن کریم کی رو سے) جو کچھ کہا گیا تھا، اس کی تفصیل پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "شعلۂ مستور" میں ملے گی جس کا نیا اور زیادہ جامع ایڈیشن (اس وقت) زیرِ طباعت ہے۔ اس میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے کوائفِ حیات بڑی تفصیل سے بیان کر دیئے گئے ہیں۔

مولانا صاحب کی مذکورہ صدر تفسیر پر تبصرہ ہم فرصت پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطالعہ کچھ وقت چاہتا ہے۔

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی اپنے متعلق کہتے ہیں۔

مریم کی طرح عیسےٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اس الہام کے مجھے مریم سے عیسےٰ بنایا گیا۔ اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا۔ (کشتی نوح، صفحہ ۱۵)

بابُ المراسلات

۱۔ حضرتِ علیؓ اور مودودی صاحب

طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں محترم محمد اسلام صاحب نے ایک خطاب پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ "مرزائیت کے نقشِ قدم پر ۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرناک"۔ اس میں انہوں نے (منجملہ دیگر امور) یہ کہا تھا کہ مودودی صاحب نے حضور رسالتمآبؐ کی شانِ اقدس و اعظم میں کیا گستاخیاں کی ہیں اور صحابہ کبار کے خلاف کس قدر طعن و تشنیع سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بتایا کہ جب مودودی صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت الیکشن میں حصہ نہیں لے گی اور ساتھ ہی یہ فتویٰ بھی صادر فرمایا کہ اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ کوئی شخص کسی منصب کے لئے خود بطور امیدوار کھڑا ہو۔ تو اس پر کسی نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت علیؓ نے جو منصبِ خلافت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا تھا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کا یہ عمل فرمانِ خدا اور رسولؐ کے خلاف تھا لہٰذا ان کی لغزش تھی جس کا ہمیں اتباع نہیں کرنا چاہیئے۔ (اسلام صاحب کا یہ خطاب طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے)

اب ہمیں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت علیؓ کی (معاذ اللہ) اسی ایک لغزش کا ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" میں ان کے خلاف اس سے کہیں زیادہ سنگین الزام عاید کیا ہے۔ انہوں نے "جنگِ جمل" اور "جنگِ صفین" وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

> حضرت علیؓ نے اس پورے فتنہ کے زمانہ میں جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھیک ایک خلیفۂ راشد کے شایانِ شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگِ جمل کے بعد انہوں نے قاتلینِ عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ جنگِ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے۔ بادلِ ناخواستہ انکو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لئے موقعہ کے منتظر تھے ...... چنانچہ جب حضرت طلحہؓ نے ان پر الزام لگایا کہ آپ خونِ عثمانؓ کے ذمہ دار ہیں تو انہوں نے جواب میں فرمایا لعن اللہ قتلۃ عثمانؓ (عثمانؓ کے قاتلوں پر خدا کی لعنت) لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے ہاں تقرب حاصل کرتے چلے گئے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ حتیٰ کہ

انہوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دیدیئے درآں حالیکہ قتلِ عثمان رضؓ میں ان دونوں صاحبوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔

حضرت علی رضؓ کے پورے زمانۂ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں (صفحہ ۱۴۶)۔ ان کا یہ فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ (صفحہ ۱۴۸)

آپ اس الزام کی سنگینی پر غور فرمایئے۔ ایک خلیفۂ راشد کے قاتل جن پر خود حضرت علی رضؓ نے خدا کی لعنت برسائی تھی، انہیں گورنری کا عہدہ دیا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ الزام جسے مودودی صاحب حضرت علی رضؓ پر عاید کرتے ہیں۔ حالانکہ انہی (حضرت علی رضؓ) کے متعلق تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب حضرت عمر رضؓ کے بیٹے حضرت عبید اللہؓ نے ان دو اشخاص کو قتل کر دیا جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ حضرت عمر رضؓ کی شہادت میں ان کا ہاتھ ہے اور یہ معاملہ حضرت عثمانؓ کے ہاں پیش ہوا کہ حضرت عبید اللہؓ کے ساتھ کیا کیا جائے تو حضرت علی رضؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں قصاص میں سزائے موت دیجائے۔

بہرحال، یہ ہیں مودودی صاحب جن کے ناوکِ طعن و تشنیع نے سلف سے خلف تک کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔ ضمناً، مودودی صاحب نے جنگِ جمل کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:-

حضرت علی رضؓ کے ہاتھوں فوجِ مقابل کے پانچ ہزار آدمی شہید اور ہزاروں آدمی مجروح ہو گئے۔ (صفحہ ۱۳۰)

ظاہر ہے کہ یہ فوجِ مقابل بھی صحابہ کرام رضؓ (یا کم از کم مسلمانوں) پر مشتمل تھی۔ کیا کوئی ان صاحب (مودودی صاحب) سے یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھوں (بقول ان کے) پانچ ہزار مسلمان شہید ہوئے، ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ لیکن ان سے پوچھے تو وہ جس میں گالیاں کھانے کی ہمت ہو۔

بہرحال، یہ ہے وہ تاریخ جسے مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں اور یہ ہے صحابہ کبارؓ اور خلفائے راشدینؓ کے متعلق ان کا عقیدہ اور مسلک۔ (طلوعِ اسلام میں ان کی اس کتاب پر بھرپور تنقید شائع ہو چکی ہے)۔

لاہور میں قیام کیلئے
پارک وے ہوٹل
PARK — WAY
صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب شرح پر
تیز عمدہ، لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے
معیاری طعام گاہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
مینیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

شعلۂ مستور

حضرت عیسیٰؑ زمرۂ انبیاء کرامؑ میں سے ہیں جن کی نبوت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لئے لازمی شرط ہے لیکن ان کی پیدائش اور وفات (یا رفع الی السماء) سے متعلق سوالات نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ (عام عقیدہ کی رو سے) انکی حدیں کفر و اسلام تک جا پہنچتی ہیں۔ پرویز صاحب نے، حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات کے ضمن میں ان سوالات پر بڑی تفصیلی اور محققانہ بحث کی اور اسے اپنی مشہور تصنیف

شعلۂ مستور

میں نہایت دلکش انداز سے پیش کیا۔ اس کتاب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی لیکن اس کا دوسرا ایڈیشن (جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا) جلد ختم ہو گیا۔ اس دوران میں یورپ میں حضرت عیسیٰؑ کے کوائف زندگی کے متعلق بڑی اہم تحقیقات ہوئیں۔ پرویز صاحب نے انہیں پیش نظر رکھ کر، حسب معمول قرآن مجید کی روشنی میں، اپنی کتاب کا تازہ ایڈیشن مرتب کیا ہے جو اس وقت پریس میں ہے اور امید ہے فروری ۱۹۷۵ء میں شائع ہو جائے گا۔ یہ ضخامت میں بھی زیادہ ہے اور اسے چھاپا بھی عمدہ سفید کاغذ پر گیا ہے۔ خواہشمند حضرات اپنی فرمائش جلد بھیج دیں تاکہ انہیں شائع ہونے کے ساتھ ہی کتاب بھیج دی جائے۔ قیمت کا اعلان آئندہ پرچہ میں کر دیا جائے گا، لیکن جن احباب کی فرمائش اس دوران میں موصول ہو گی۔ انہیں پہلے اطلاع دے دی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی۔ گلبرگ۔ لاہور

المودّت

★ ڈاکٹر سید عبد الودود صاحب

[ڈاکٹر سید عبد الودود صاحب حلقہ طلوعِ اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فکرِ قرآنی سے ان کی دیرینہ وابستگی۔ طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے ان کے فکر انگیز مقالات اور ان کی مایۂ ناز تصنیف (Phenomena of nature and the quran) جو مشرق و مغرب کے محققین سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ ان کی شہرت کی ثقہ اسناد ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم کا مرکزی مقصد سفرِ حیات میں کاروانِ انسانیت کی راہ نمائی ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے وہ عالم النفس و آفاق کے حقائق و شواہد بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے ان حقائق کا علم بھی ضروری ہے۔ لیکن ان تمام حقائق کی تحقیق یا تحقیقات کا پورا پورا علم کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی ایک جماعت مل کر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرے۔ لیکن جب تک ایسا ممکن نہ ہو، کم از کم اتنا ہی ہو کہ جو صاحبِ بصیرت جس شعبۂ علم کا ماہر ہے، وہ اسی گوشے میں قرآنی حقائق کی تحقیق کرے۔ ڈاکٹر سید عبد الودود صاحب نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے پہلے پورے قرآن کریم کا فکری انداز سے مطالعہ کیا اور اس کے بعد اس کے اس گوشے کو اپنایا جو ان کا مخصوص شعبہ علم ہے۔ یعنی طبیعیاتی سائنس۔ اپنی اس تحقیق کا ماحصل انہوں نے اپنی اس شہرۂ آفاق تصنیف میں پیش کیا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی وہ اپنی تحقیقات میں بدستور مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت کو انہوں نے (نمونۃً) اپنے اس مقالہ میں پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے۔ اس مقالہ کا موضوع چونکہ فنی ہے اس لئے اس سے کما حقہٗ وہی ارباب علم مستفید ہو سکیں گے جو اس شعبہ علم پر غائر نگاہ رکھتے ہیں لیکن اگر دوسرے اہل علم بھی فکر و تدبر سے اس کا مطالعہ کریں گے تو وہ بھی اسے دلچسپ اور مفید پائیں گے۔

ہماری (اردو) زبان ہنوز اس قسم کے فنی موضوعات کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس مقالہ میں آپ کو بہت سے الفاظ اور اصطلاحات انگریزی زبان میں ملیں گی۔ یہ ناگزیر تھا۔ اس لئے ہم اس کے لئے (انگریزی نہ جاننے والے قارئین سے) معذرت خواہ ہیں۔ اب آپ، ڈاکٹر صاحب کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ طلوعِ اسلام]

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر "المودت" کا لفظ جس کا مادہ (و د د) ہے مختلف ترکیبوں میں استعمال ہوا ہے۔

جس کے معنی باہمی کشش اور جاذبیت کے ہیں۔ مثلاً :-

ایک مقام پر غیر مسلموں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ پھر کہا کہ مرنے کی تمنا تو ایک طرف ۔ ۔ ۔ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ (۲/۹۶) یعنی ان کے اندر دنیاوی زندگی کی کشش اس قدر ہے کہ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اسے ہزار سال تک زندگی مل جائے۔

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے مطابق صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہیں، انہیں چاہیے ان کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو لیکن ان کے پروگرام میں اتنی کشش موجود ہوتی ہے کہ بالآخر مخالفین اس پروگرام کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں جن کے کروہ پہلے مخالف تھے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (۱۹/۹۶)

اسی طرح ایک اور مقام پہ کہا گیا ہے کہ اے رسول! تو ان مخالفین سے یہ بھی کہہ دے کہ میں جو تمہیں برائیوں سے بچا کر بھلائیوں کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس میں نہ میرا کوئی ذاتی فائدہ ہے اور نہ اس کے بدلے میں کوئی اجر مانگتا ہوں لیکن تم اپنی مخالفت میں اس حد تک بڑھے ہوئے ہو کہ قریبی رشتہ داروں میں آپس میں جو جاذبیت ہوتی ہے تم نے وہ بھی ختم کر دی۔ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (۴۲/۲۳)

مندرجہ بالا مقامات پر يَوَدُّ - وُدًّا - اَلْمَوَدَّةَ کے الفاظ آئے ہیں۔

خود اللہ تعالےٰ کو الودود کہا گیا ہے جس طرح وہ السمیع ہے اور اس کی سماعت لامحدود ہے وہ البصیر ہے اور اس کی نگاہ لامحدود ہے۔ اسی طرح وہ الودود بھی ہے۔ یعنی خالق اور مخلوق کی باہمی کشش لامحدود ہے۔ اللہ تعالےٰ کی یہی صفتِ مودّت اشیائے کائنات میں کسی نہ کسی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق کے اندر موجود ہے یہ چیز قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے لئے الودود کا لفظ کائنات کی تخلیق اور ارتقا کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (۸۵/۱۳-۱۵) یعنی اللہ وہ ہے جو ہر چیز کو ان کے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا ہے۔ پھر اسے یکے بعد دیگرے نئی تخلیق میں ڈھالتا ہوا اور ارتقائی مراحل سے گزارتا ہوا نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ ان تخلیقی مراحل سے گزارنے میں اللہ تعالےٰ کی دو صفات کا ذکر ہے۔ وہ الغفور ہے اور الودود ہے۔ یعنی ہر تخلیقی مرحلے پر وہ اشیائے کائنات کے لئے تخریبی قوتوں سے حفاظت کا سامان مہیا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ الودود بھی ہے۔ یعنی وہ اشیا کے اندر باہمی کشش اور جاذبیت کو برقرار رکھتا ہے۔ جس کے بغیر اشیا کی نشوونما اور ایک ارتقائی مرحلہ سے دوسرے مرحلہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اللہ تعالےٰ نے کائنات کے مرکزی کنٹرول کو جو بڑی قوتوں کا حامل ہے۔ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس کے لئے قوانین مقرر کر دئیے ہیں۔ جہاں تک تخریبی قوتوں سے سامانِ حفاظت مہیا کرنے اور انہیں خس و خاشاک سے پاک کر کے ارتقائی منازل سے گزارنے کا تعلق ہے اسے میں اپنی کتاب

(Phenomena of nature and the Quran)

میں اشیائے کائنات کی (Survival and extinction) کے سلسلے میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی صفت مودّت کا ذکر مقصود ہے اور جس طریق سے اس کا اشیائے کائنات میں اظہار ہوتا ہے، اس کا ذکر مطلوب۔

چھوٹے سے چھوٹی سطح پر ایٹم کو لے لیجئے۔ دو ایٹم مل کر ایک (Compound) نہیں بنا سکتے۔ یعنی نئے تخلیقی مرحلے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان میں باہمی کشش یا مودّت موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک ایٹم سوڈیم کا ہے اور ایک کلورین کا۔

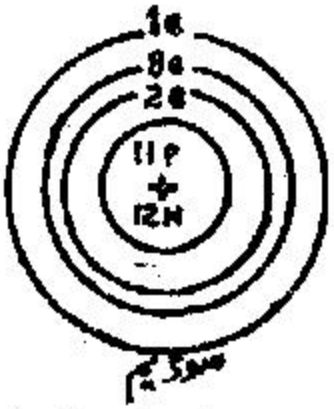

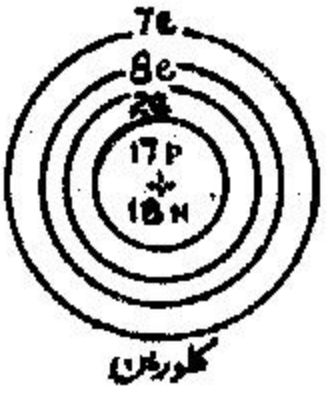

جب یہ دو قسم کے ایٹم ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، تو ان میں باہمی کشش پیدا ہوتی ہے

کشش کی وجہ یہ ہے کہ کلورین کے ایٹم کے بیرونی (Shell) میں سات الیکٹرون ہیں جب کہ سوڈیم کے ایٹم کے بیرونی (Shell) میں صرف ایک الیکٹرون ہے۔ جس طرح دوسرے (Shell) میں دونوں ایٹموں میں سے ہر ایک میں آٹھ الیکٹرون ہیں۔ اسی طرح تیسرے (Shell) میں آٹھ آٹھ ہونے چاہئیں۔ لیکن یہاں کلورین کے باہر کے شیل میں ایک ایٹم کم ہے اور سوڈیم کا ایک زائد۔ سات کی قوت ایک کے مقابلے میں سات گنا ہے۔ اس لئے کلورین ایٹم، سوڈیم ایٹم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور وہ دونوں جڑ کر (Sodium Chloride) یعنی نمک بنا دیتے ہیں جو ایک نئی تخلیق ہے۔ یعنی اس مرحلہ پر کلورین اور سوڈیم ایٹمز ایک دوسرے کے زوج بن جاتے ہیں اور یہ زوجیت ہر تخلیقی مرحلے میں موجود ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۱/۴۹) اور ہم نے ہر شے کے ساتھ دوسری شے اس طرح پیدا کر دی ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث بنتی ہیں۔ تاکہ تم قوانین خداوندی پر غور کر سکو۔

کائنات میں زندگی کی نمود کے بعد جب تخلیق اس مرحلہ پر پہنچ گئی کہ (Sex) صنف معرض وجود میں آگئی، تو زندگی کے ہر شعبے میں زوجین اور ان کی باہمی کشش بھی نمایاں طور پر سامنے آگئی۔

نباتات میں جا بجا زوجین موجود ہیں اور حیوانات میں بھی۔ اور زوجین میں باہمی کشش کی مختلف شکلیں موجود ہیں (میں اپنی کتاب میں جنس کا ذکر پہلے آچکا ہے) واضح کر چکا ہوں کہ (Sex) کا مقصد صرف (Reproduction) افزائش نسل نہیں کیونکہ (Reproduction) کا عمل تو (Sex) کے معرض وجود میں آنے سے پہلے بھی موجود تھا۔ Sex دراصل (Adaptation) ہے۔ یعنی دو افراد، جہاں انفرادی طور پر حالات کا مقابلہ نہ کر سکیں وہاں دونوں مل کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے (Green Algee) کائی کی مثال پیش کی تھی۔ ہم

ہم تالاب کی تہہ میں جو سبز رنگ کی جمی ہوئی چیز دیکھتے ہیں۔ یہ کائی ہے لعد نباتات کی بہت ابتدائی قسم۔ کائی کے ایک تنکے

میں (Cell) کی ایک کالونی ہوتی ہے یعنی بہت سے (Cells) ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر ایک تنکا بناتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں یہ (Cell) ایک سے دو دو سے چار، اور چار سے آٹھ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کائی کا تنکا نشوونما پاتا جاتا ہے۔ سخت سردی میں یہ نشوونما رک جاتی ہے اور تنکے کے مردہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی کو بچانے کی خاطر اور آئندہ نشوونما کی خاطر دو تنکے آپس میں زوج بن جاتے ہیں اور ان میں باہمی کشش مودت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تنکے کا ایک (Cell) دوسرے تنکے کے ایک (Cell) میں جذب ہونے کی کوشش کرتا ہے (Fig. 2) اس (Cell) کا سارا مادہ اپنے زوج میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے ملنے سے (Cyst) بن جاتی ہے جس کے باہر سخت خول پیدا ہو جاتا ہے جو سردی سے روکتا ہے اس کے بعد دونوں تنکوں کے باقی سارے (Cells) سردی سے ضائع ہو جاتے ہیں صرف (Cyst) باقی رہ جاتی ہے۔ جب موسم بہار آتا ہے تو اس (Cyst) میں سے نئی شاخ پھوٹ پڑتی ہے اور نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ (Cell) کی باہمی کشش، رحمت یعنی باہمی نشوونما کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے یہ عمل واضح ہو جاتا ہے۔

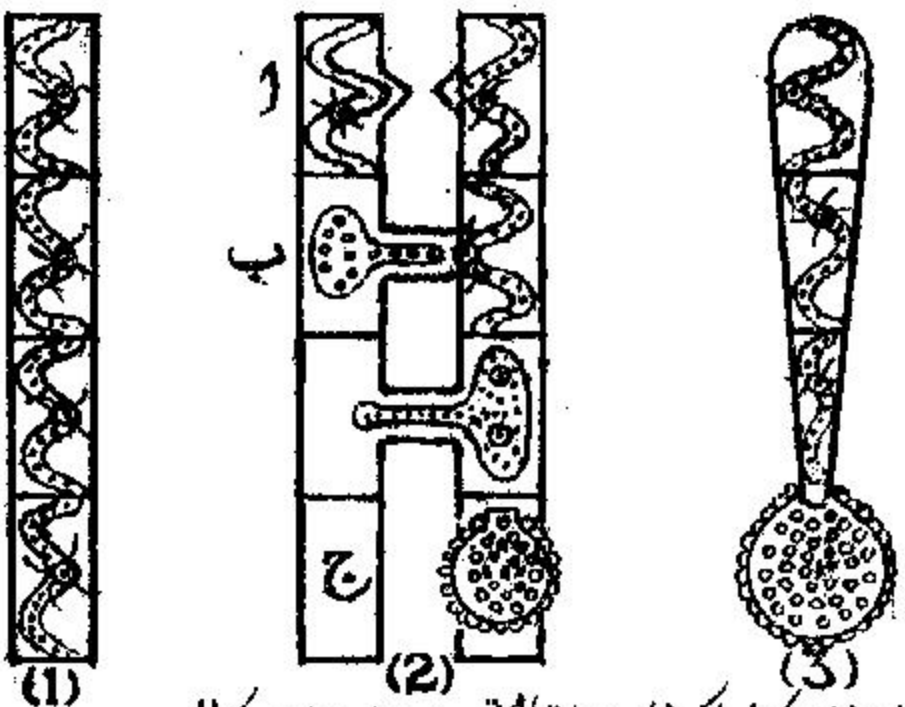

کائی (جو زندہ اشیا کی نہایت ابتدائی قسم ہے) میں صنف کا ظہور۔

(۱) آپس میں جڑے ہوئے (Cells) کا ایک تنکا۔

(۲) کائی کے دو تنکے ایک دوسرے کے بالمقابل پڑے ہیں۔

(الف) دو بالمقابل پڑے ہوئے (cells) کے درمیان پُل بن رہا ہے۔
(ب) ایک (cell) کا مادہ دوسرے (cell) کی طرف بڑھ رہا ہے۔
(ج) دونوں (cells) کا مادہ یکجا ہونے کے بعد (cyst) بن گئی ہے۔
(۳) موسم بہار میں (cyst) کے اندر سے (cells) کی نئی کالونی پھوٹ پڑی ہے۔

مندرجہ بالا زوجیت اور مودّت کی وہ مثالیں پیش کی ہیں جو عام مشاہدہ میں نہیں آتیں۔ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے نر اور مادہ کی زوجیت اور باہمی کشش ایک عام مشاہدے کی بات ہے لیکن چونکہ حیوانات کی ان گنت قسمیں زمین پر موجود ہیں اور ہر ایک کی زوجیت اور مودّت کی مختلف شکلیں اور مختلف مقاصد ہیں۔ اس لئے چند ایک اور مثالیں پیش کرنی ضروری ہیں۔ حال ہی (Monogamous Animals) پر ریسرچ ہوئی ہے جو بڑی دلچسپ ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ شاید حیران ہوں گے کہ (Monogamous Animals) کے کیا معنی؟ خود حضرت انسان ہر قسم کے ضابطوں میں بندھا ہوا ہونے کے باوجود (Monogamy) یعنی ایک زوج پر قناعت نہیں کرتا، تو حیوانات میں (Monogamy) کس طرح ممکن ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیوانات جو گروہ در گروہ زمین پر بکھرے ہوئے ہیں کسی ضابطے کے پابند نہیں، لیکن جو کچھ میں ابھی بیان کروں گا اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح حیوانات کی بعض قسمیں (Strictly Monogamous) ہیں اور جوڑوں کے اندر مودّت کا عمل کس شدت سے کارفرما ہے۔

(Cichlid) ایک مچھلی ہے جو مغربی افریقہ کے دریاؤں میں رہتی ہے۔ اس مچھلی کے بڑے بڑے غول پانی کے اندر تیرتے نظر آتے ہیں لیکن اکثر ان کے جوڑے بھی دیکھے جاتے ہیں۔ ہر جوڑا جس علاقے میں رہتا ہے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پانی میں جو پتھر پڑے ہوتے ہیں۔ ان کے سوراخوں میں مادہ مچھلی انڈے دیتی ہے پھر نر انڈوں کو (Fertilise) کرتا ہے۔ مچھلی کے انڈوں کو (Fertilise) کرنے کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ مچھلی جب انڈے دے چکتی ہے تو پانی میں پڑے ہوئے انڈوں پر نر اپنے (Spermatozoa) بکھیر دیتا ہے۔ اس کے بعد نر اور مادہ دونوں مل کر ان انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ انڈوں سے (Larvae) نکلتے ہیں۔ (Larva "سُنڈی" کی شکل کی چیز ہوتی ہے) جو نشوونما پا کر مچھلی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دونوں نر اور مادہ (Larvae) کو اپنے منہ میں لے لیتے ہیں اور ریتلی جگہ میں ایک گڑھے کے اندر جو پہلے سے تیار شدہ ہوتا ہے۔ اس میں انہیں ڈال دیتے ہیں۔ یہاں (Larvae) مچھلیاں بن جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں اپنے والدین کے گرد ایک ٹھوس غول کی شکل میں گھومتی رہتی ہیں اور جب کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو والدین اپنے سر کو جھٹکا دیتے ہیں جو خطرہ کی جگہ سے باہر نکلنے کا اشارہ ہوتا ہے۔ پورے (Breeding cycle) یعنی انڈوں کے وقت میں یہ مچھلیوں کا جوڑا اکٹھا رہتا ہے۔ ان میں آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ان کا اس دوران میں اکٹھے رہنا (Sexually motivated) ہے یعنی مقصد اولاد پیدا کرنا۔ اس عرصہ میں یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں اور اگر دونوں کے درمیان ایک مصنوعی دیوار کھڑی کر دی جائے، تو یہ اس دیوار کو پھلانگنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ گو یہ ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہتے ہیں لیکن اپنی ہی نوع کی کوئی دوسری مچھلی نزدیک آتی ہے تو اس سے لڑائی کرتے ہیں۔ مادہ جب انڈے دے چکتی ہے تو نر ان کو (Fertilize) کر چکتا ہے، تو اس کے بعد (Sexual Motive) ختم ہو جاتا ہے اور پھر ان کے اکٹھے رہنے کا مقصد بچوں کی حفاظت ہوتا ہے۔ اس دوران میں مچھلیوں کے جوڑے میں آپس میں فاصلہ چاہے کسی وقت زیادہ بھی ہو جائے لیکن دونوں میں سے کوئی ایک ہر وقت بچوں کے پاس رہتا ہے۔ اگر بچوں کو اس ماحول سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو (Parent Fish) مچھلیوں کا جوڑا آپس میں لڑ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ جب اگلا (Breeding Cycle) شروع ہوتا ہے تو پھر وہی مچھلیوں کا جوڑا، نر اور مادہ، دوبارہ اکٹھے ہو جاتے ہیں چنانچہ ہر (Breeding cycle) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ (Permanent Monogamy) کی ایک مثال ہے۔

اب دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ (Shrimp) ایک چھوٹی سی مچھلی کی طرح کا جانور ہے جس کے جسم پر سخت خول ہوتا ہے اور یہ صرف (۳) یا (۴) سنٹی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ جبڑے کے ساتھ دو لمبی لمبی (Antanae) مونچھیں ہوتی ہیں جو سخت ہوتی ہیں۔ (Shrimp) بھی عام طور پر سمندری پانی میں رہتی ہے۔ (Cichlid) کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ ان میں ایک جوڑے کی باہمی کشش کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک اولاد پیدا کرنا، اور دوسرے اولاد کی حفاظت، لیکن (Shrimp) کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ ان کی (Monogamy) نرالی قسم کی ہے۔ ان میں بھی جوڑے ہوتے ہیں جو عمر بھر اکٹھے رہتے ہیں لیکن ان کی باہمی کشش اور دلچسپی کس وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہو سکا۔ (Shrimp) کا خوراک کے حصول کا طریق بھی دلچسپ ہے یہ (Star Fish) کے سخت خول میں سوراخ کر دیتی ہے اور ان باریک سوراخوں میں سے اس کے جسم کو کھاتی رہتی ہے اپنے سے دو یا تین گنا بڑی (Star-fish) پر حملہ کر کے اسے نڈھال کر دیتی ہے۔ اس خوراک کے حصول میں (Shrimp) کے جوڑے کا ٹیم ورک نہیں ہوتا۔ یہ انفرادی طور پر خوراک حاصل کرتے ہیں لیکن رہتے اکٹھے ہی ہیں۔ مادہ (Shrimp) اپنے انڈوں کو پیٹ کے نیچے اٹھائے پھرتی ہے اور خود ان کی حفاظت کرتی ہے۔ جب انڈوں میں سے بچے نکل آتے ہیں تو یعنی اس کے ساتھی نر کا بچوں کی حفاظت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے اکٹھے رہنے کا مقصد نہ خوراک کا حصول ہے نہ بچوں کی پرورش۔ اور آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس کا مقصد (Sexual Motivation) یعنی افزائش نسل ہی نہیں (Shrimp) مادہ ہر اٹھارہ دن کے بعد اپنے جسم کے باہر کا چھلکا اتار دیتی ہے اور یہ اس کے انڈوں کو (Fertilise) کرنے کا وقت ہوتا ہے جو صرف چند گھنٹے رہتا ہے۔ ان چند گھنٹوں میں اگر کوئی نر (Shrimp) نزدیک ہے تو (Fertilization) ہو جاتی ہے۔ ورنہ اس (Cycle) میں کوئی افزائش نسل نہیں ہوتی۔ جب مادہ ہر اٹھارہ دن کے بعد اپنے جسم کا چھلکا اتارتی ہے تو اس سے ایک خاص قسم کی بو پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے اردگرد کے تمام (Shrimp) اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان میں باہمی جنگ و جدل ہوتی ہے اور جو سب سے

زیادہ طاقتور اور موزوں انڈوں کو (fertilise) کرتا ہے۔ اس کے بعد سارے نر اپنی اپنی جگہ پہ چلے جاتے ہیں اور اپنی اپنی "ساتھن" کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک نر اور مادہ (Shrimp) کے جوڑے کی باہمی کشش، افزائش نسل کے لئے بھی نہیں۔ غرضیکہ اس کی کوئی (Biological) وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ اس کے باوجود ایک جوڑے میں باہمی کشش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ اگر اندھیرے میں دونوں کو الگ کر دیا جائے تو نر اندھیرے میں تیرتا ہوا اپنی ساتھی مادہ کو جہاں بھی ہو، ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس دوران میں اگر راستہ چلتے چلتے کوئی دوسری مادہ راستے میں مل جائے، تو اسے ذرا سا چھو کر الگ ہو جاتا ہے تاآنکہ وہ اپنی (Mate) کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کے سونگھنے کی حس بڑی تیز ہوتی ہے اور اس کے متعلق دلچسپ تجربے کئے گئے ہیں۔ اس کے لئے ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے:۔

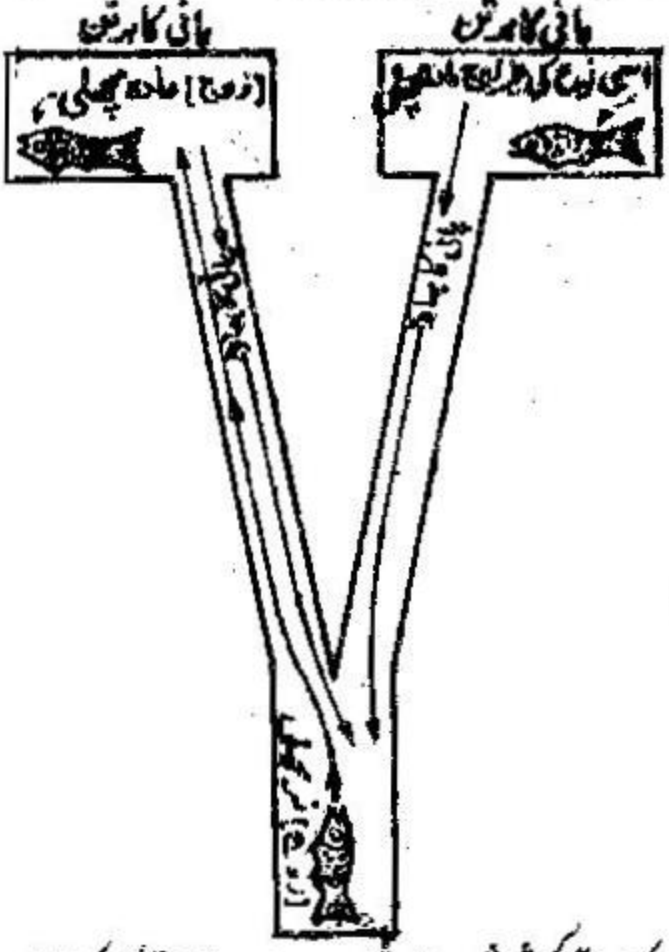

ایک Y ٹیوب ہے کہ اس کے اوپر کے سروں کو دو برتنوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ جن کے اندر پانی ہوتا ہے۔ ایک برتن میں ایک نر کی (Mate) کو رکھ دیا جاتا ہے اور دوسرے برتن میں کسی اور ہم جنس مچھلی کو۔ پانی اوپر سے نیچے کو بہتا ہے۔ ٹیوب کے نچلے سرے میں جو کافی فاصلے پر ہوتا ہے۔ نر (Shrimp) کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نر، اوپر جا کر ہمیشہ ٹیوب کی اس شاخ میں داخل ہوتا ہے جس طرف اس کی اپنی (Mate) ہے۔ اور اس عمل میں کبھی استثنا نہیں ہوتا۔ حقیقت میں جوڑا جب آپس میں پہلی بار ملتا ہے، تو مادہ کی بو، نر کے اندر اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ وہ ساری عمر قائم رہتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک ایسی مثال ہے جس میں جوڑا تا عمر اکٹھا رہتا ہے لیکن ان کے اکٹھے رہنے کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا۔

ایک اور مثال نر اور مادہ پرندوں کے جوڑے کا باہمی کشش ہے جو (Duet - Songs) کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس جوڑے کی باہمی رفاقت اور کشش تا عمر رہتی ہے۔ اس جوڑے میں سے ایک جب آواز نکالتا ہے، تو دوسرا اس کا جواب دیتا ہے۔ جس کا وقت اور مقصد ساتھی کی آواز کے مطابق ہوتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک پرندہ ہر وقت ایک ہی آواز نکالتا ہے۔ مختلف وقتوں میں یہ آوازیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ان کے جواب بھی جوڑے کی آواز کے مطابق مختلف۔ ان آوازوں کا مقصد نر اور مادہ دونوں کا

ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ کبھی بچھڑ جائیں، تو ایک دوسرے کو ڈھونڈنا اور کسی خاص وقت پر کسی خاص مدعا کا اظہار۔ مثال کے طور (Yellow Breast Barbet) کا جوڑا (Alternately) یعنی باری باری سے آواز نکالتے ہیں اور کسی ایک مقصد کے لئے ہمیشہ وہی آواز دہرائی جاتی ہے لیکن نر کی آواز اور ہوتی ہے اور مادہ کی اور۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ پرندے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔

(African Drougt) ایک پرندہ ہے جس کا (Duet Song) زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ جوڑے میں سے ایک جب آواز نکالتا ہے تو اس کی (Duet) چار یا پانچ منٹ تک جاری رہتی ہے، جس میں مختلف آوازوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ ہر ایک (Duet) کے قریباً (۲۰) انفرادی عناصر ہو سکتے ہیں۔ ان پرندوں کی آوازوں کا تجزیہ، آوازوں کو گراف پر ریکارڈ کر کے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب جوڑے میں سے ایک اپنی آواز کو ختم کرتا ہے، تو دوسرا اس کا جواب دیتا ہے اور ریکارڈنگ سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کی آوازوں کے (Elements) مختلف ہیں۔ گویا ہر موقع کے مطابق ایک پرندہ آواز نکالتا ہے اور دوسرا اس کا جواب دیتا ہے۔ ایک جب اپنی آواز کو ختم کرتا ہے تو دوسرے کا ردعمل اتنا تیز ہوتا ہے کہ دونوں کی آواز کے درمیان صرف (200.m Sec.) کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک جوان پرندے کو یا کسی جوڑے کے کسی ایک فرد کو جس کا ساتھی مر چکا ہو۔ نئے ساتھی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ قریبی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان پرندوں کی باہمی کشش اور رفاقت کا مقصد بھی (Cichlid) مچھلی کی طرح افزائش نسل اور بچوں کی حفاظت ہوتا ہے۔ یہ بھی مستقل (Monogamy) کی ایک مثال ہے۔ گو اس کی طرز مختلف ہے۔

گو مستقل (Monogamy) کی مثالیں حیوانات کے اندر بھی موجود ہیں لیکن ان میں اکثر (Polygamous) بھی ہیں، اس لئے (Monogamy) کے مقاصد واضح نہیں اور مختلف حیوانات میں جو مختلف (Family-Pattern) پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ حیوانات کی ارتقائی منازل بھی ہیں۔

مثال کے طور پر بن مانس کی چار مختلف قسموں کی ارتقائی منزل مشترک ہے لیکن ہر ایک کی (Family-Structure) دوسرے سے مختلف ہے۔ ان میں سے (Orangatan) اکیلا بغیر (Mate) کے زندگی گزارتا ہے۔ (Chimpanzee) گروپ میں رہتے ہیں جہاں عام آزادی ہوتی ہے۔ یہ (Loose Knit) فیملی ہوتی ہے۔ جہاں کوئی نر کسی مادہ سے مل کر افزائش نسل کرتا ہے (Gorilla) "حرم" کو پسند کرتا ہے۔ ایک گروپ میں ایک نر اور باقی سب مادہ ہوتی ہیں۔ ان سب کے برعکس (Gibbon) کے اندر مستقل (Monogamy) ہے۔ ایک نر اور ایک مادہ اکٹھے زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح مچھلیوں کے اندر کچھ (Monogamous) ہے اور کچھ (Polygamous) ہیں۔ جہاں تک حضرت انسان کا تعلق ہے چونکہ یہ اختیار و ارادہ کا مالک ہے۔ اس لئے انسانی آبادی میں آپ کو (Orangatan) بھی مل جائیں گے اور (Chimpanzee) بھی۔ اور (Gorilla) بھی۔ گو اکثر انسانی آبادی (Gibbon) کی طرح (Monogamous)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف حیوانات میں مختلف (Family Patterns) کیوں ہیں؟ اب توجہ کا رُخ اس طرف مڑ جاتا ہے کہ ان مختلف (Patterns) کی نسبت شاید Ecological Conditions سے ہے (Ecology) علم حیوانات و نباتات (Biology) کی وہ شاخ ہے جس میں اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ زندہ اشیاء کی، اپنے ماحول، عادات، طرز زندگی اور آبادی کے ساتھ کیا نسبت ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ (Family Pattern) کا تعلق (Ecological conditions) سے ہے تو یہ معاملہ یقیناً (Adaptation) یعنی اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کا ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسانی آبادی میں بھی مختلف (Patterns) کی اجازت ہونی چاہیئے؟ یا یہ کہ اس قسم کی تفریق کی ضرورت کبھی ہے یا نہیں؟

جہاں تک قرآن کریم کی تعلیم کا تعلق ہے (Family Pattern) اور (Ecological Conditions) کا تعلق بڑی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قرآن نے انسان کے لئے (Monogamy) کی اجازت دی ہے لیکن اس کے ساتھ چند مخصوص حالات کے تحت اس میں ڈھیل بھی دے دی گئی ہے اور یہ مخصوص حالات آبادی کے متعلق ہیں۔ قرآن نے ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کی اجازت دے دی ہے بشرطیکہ جن حالات میں پہلی بیوی کو الگ کرنے کی اجازت ہے اس کے تمام تقاضے پورے ہوں لیکن بیک وقت ایک سے زائد بیویوں کی اجازت صرف آبادی کا تناسب بگڑنے کی صورت میں دی ہے قرآنی معاشرے کی رُو سے جو مسلمان قوم معرض وجود میں آتی ہے وہ ہمیشہ ایک عسکری قوم ہوتی ہے جو قرآنی معاشرے کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اس میں اسے وقتاً فوقتاً جنگوں کی بھی لازمی طور پر ضرورت پڑتی ہے۔ ایسی صورتوں میں مردوں کی آبادی کم اور عورتوں اور بچوں کی آبادی کے نسبتاً بڑھنے کا احتمال ہوتا ہے اور ایسے ہنگامی حالات میں نظام عدل کے بگڑنے کا احتمال بھی چنانچہ ایسی صورت میں نظام عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کہا گیا۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ لاوارث بچوں اور عورتوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں (حالات کے مطابق) دو دو، تین تین یا چار چار سے نکاح کر لو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو صرف ایک کی اجازت ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے (Monogamy) یعنی ایک نر اور ایک مادہ کے جوڑے کے مقاصد مختلف حیوانات میں قریباً ملتے جلتے ہیں۔ گو اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ جہاں تک افزائش نسل کا تعلق ہے۔ یہ بغیر (Monogamy) کے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جہاں تک اولاد کی پرورش کا تعلق ہے، یہ (Monogamy) کی صورت ہی بہتر ہو سکتی ہے لیکن جیسا کہ (Shrimp) کے متعلق کہا جا چکا ہے، یہاں اکیلی مادہ بغیر زوج کے اس کام کو سرانجام دیتی ہے۔ البتہ انسانی سطح پر زوجین کے باہمی ربط کے مقاصد افزائش نسل اور اولاد کی حفاظت سے آگے ہیں۔ یہاں اولاد کی حفاظت کے ساتھ اولاد کی تربیت کا

مرحلہ میں در پیش ہوتا ہے۔ جس طرح زندگی کی نچلی سطح پر (Monogamous) جوڑہ صرف (Breeding ساتھ Season) میں جمع ہوتا ہے، انسانی سطح پر اس طرح وقتی طور پر اکھٹے ہونا نہ تو کافی ہے اور نہ ہی عملی طور پر ممکن۔ اس لئے کہ انسان میں کوئی (Breeding Season) نہیں ہوتا۔ انسانی سطح پر جوڑے کا تاحیات اکھٹے رہنا ہی قابل عمل چیز ہے، نہ صرف اولاد کی خاطر بلکہ انسانی جوڑے کی اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کی خاطر بھی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۳۰/۲۱) آیاتِ خداوندی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے (Reproductive Unit) تخلیقی اکائی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے۔ تاکہ تمہیں سکون قلب حاصل ہو اور تمہارے اندر باہمی جاذبیت پیدا کی تاکہ تمہارے لئے بلا معاوضہ خوشگواریوں اور ذاتی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا ہو سکے۔

یہاں ایک چیز قابل ذکر ہے۔ عام طور پر مودّت کے لفظ کا ترجمہ محبت کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے لیکن لفظ مودّت کے معنی زیادہ وسیع ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ مودّت یا باہمی کشش حیوانات کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور زندگی کی نچلی سطح پر ہر جگہ پائی جاتی ہے (Inorganic world) بے جان اشیا میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن محبت ایک (Psychological Phenomenon) ہے جو صرف انسانی سطح پر موجود ہے۔ اس لئے جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ مودّت کے معنی محبت بھی کئے جا سکتے ہیں لیکن مودّت کا مفہوم زیادہ وسیع ہے جس طرح (Sex) صنف اور (Reproduction) افزائش نسل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسی طرح صنف اور محبت بھی دو الگ الگ چیزیں ہیں (Sex) صنف (Adaptation) یعنی ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے اور (Self-preservation) تحفظ ذات کی مظہر ہے، اور محبت ایک (Psychological) جذبہ ہے جو بیوی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اولاد سے بھی ہو سکتی اور کسی اور سے بھی!

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت:۔ دفتی بورڈ | -/۲۰ روپے

قیمت:۔ (خوبصورت جلد کے ساتھ) | -/۳۵ روپے

جلد حاصل کیجئے

ناظم

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۹۴ء

فکر و احساس کی تربیت گاہیں

(پروفیسر علاؤالدین اختر)

عزیزانِ گرامی قدر۔

آپ کو یاد ہوگا۔ پچھلے دو سالانہ جلسوں میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کے بارے میں آپ سے چند باتیں کر چکا ہوں۔ بات چیت تعلیمی اداروں کے حوالہ سے ہوئی تھی۔ آغاز یوں ہوا تھا کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے، اور پھر وضاحت کی گئی تھی کہ دنیا میں دیگر نظریاتی ملکوں سے اگر پاکستان علیحدہ نوعیت کا حامل ہے تو کیسے اور کیونکر۔ اس سلسلے میں ان راہنما اصولوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو اس ملک کو دوسرے نظریاتی ملکوں سے ممتاز اور الگ حیثیت دیتے ہیں اور اس کی صحت، استحکام اور بقا کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ضمانت کے سلسلے میں نظریاتی سرحدوں کے پھیلنے، سکڑنے اور سمٹنے کے حوالے سے جغرافیائی سرحدوں میں آئے دن رد و بدل کے قوی اور موہوم دونوں قسم کے خدشوں کا تذکرہ ہوا تھا۔ ملکی اور ملی صحت اور استقامت کے لئے انفرادی اور اجتماعی تقاضے زیر بحث آئے تھے۔ بصیرت اور کردار کے لئے زبان و بیان کی نفسیات اور اس کی اہمیت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اپنے اور دیگر معاشروں بلکہ ملکوں کے فکری اور عملی تضاد کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ خلوص کے فقدان سے قول و فعل پر تشنگی اور محرومیوں کے جو سائے پھیلتے ہیں اور ناہمواریاں جس طور موجود تھیں یہ بنتے لگتی ہیں ان کی پرچھائیاں بھی دیکھی گئی تھیں۔ مگر یاد ہوگا آپ کو یہ ساری باتیں التزاماً تعلیمی اداروں کی چار دیواری کی حدود کے اندر ہی رکھی گئی تھیں۔ دوسرے سالانہ اجلاس میں البتہ گفتگو کے آخر میں تعلیم کے انتظامی اور تدریس کے انفرادی ڈھانچوں سے ورے بھی ذرا جھانکا گیا تھا مگر کسی دیگر معاشرتی ادارے کو موضوع بحث نہ بنایا گیا تھا۔ صرف ابلاغ عامہ کے عمومی نوعیت کے اداروں کے اس رول کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو وہ فکر اور احساس کی تربیت میں ادا کر سکتے ہیں۔

میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس سال کے اجلاس میں میری اور آپ کی گفتگو ہوئی تو اس میں انشاء اللہ میں اپنی گفتگو کا دائرہ وسیع کروں گا۔ بحث و تمحیص کو تعلیمی اداروں کی حدود سے باہر نکالا جائے گا۔ فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کے لئے جو دیگر جدید جدید واسطے بھی فعال ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں ان کو بھی بات چیت کا عنوان بنایا جائے گا تاکہ دیکھا جا سکے کہ پاکستان جو ایک نظریاتی ملک ہے اس میں فکر اور احساس کی تربیت اس طور ہو سکے کہ اسلام کے تمام پہلو جو دین آنے والا ملک اسلامی طرز پر زندگی بسر کرنے کی فضا بہم پہنچا سکے۔ تعلیم و تربیت تعلیمی اداروں تک محدود نہیں کی جا سکتی، خصوصاً جب بات فکر اور احساس کی ہو تو گھر والے اور معاشرے کے دیگر فعال اداروں اور زندگی کی سبھی توانائیوں کو ہر سمت سے ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہونا ہوگا۔

تعلیم و تربیت کسی نصب العین کے حوالے سے ہوا کرتی ہے، اس لئے ان سمتوں اور ذریعوں کو اشاروں کنایوں میں سامنے لایا گیا تھا جس منزل کی طرف بڑھنا مقصود تھا۔ اس کا تعین بھی بہت واضح انداز میں کر دیا گیا تھا۔ چاہے وہ الفاظ کی حد تک ہی سہی، کہ ضرور دیا گیا تھا۔ سمتیں اور ذریعے معاشرتی زندگی کے وہ متعدد زاویے سمجھے گئے تھے جو افراد اور معاشروں کو ان کا تشخص دیتے ہیں۔ سمتیں اور ان قدروں کی علامتیں مانی گئی تھیں یا وہ راہیں تسلیم کر لی گئی تھیں جن کے توسط سے جادۂ منزل پر گامزن ہوا جا سکتا ہے اور منزل یہ قرار پائی تھی کہ پاکستان چونکہ اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس لئے ہر پاکستانی کے فکر اور احساس کو قرآنی احکام کی منہ بولتی تصویر بنا ہوگا تاکہ ان کے شب و روز قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں بسر ہوں۔ یاد رکھئے۔ قائداعظم نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ اس مملکت کو دائیں یا بائیں بازو کی فہم کے مطابق ایک سیکولر سٹیٹ بنا دیا جائے، دوسری طرف یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں کہ ان کے ذہن میں (THEOCRATIC) پاکستان کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ مگر جو شخص یہ دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی سمٹ سمٹا کر طبیعی زندگی تک رہ جائے گی۔ ان کی ذات کا ارتقا ممکن نہ ہوگا۔ انہیں وہ شادمانی نصیب نہ ہوگی جو ذات کی بالیدگی اور استحکام سے حاصل ہوتی ہے تو وہ پاکستان کو لادینی افکار کی "جنت ارضی" کس طرح بنا سکتا تھا۔ وہ قائد جس نے ہند کی تاریخ میں شعور کا حشر دیکھا ہو وہ خدا کے نام پر حاصل کئے ہوئے ملک میں بقائے فضیلتِ انسانی کے احکام خداوندی سے کس طرح منہ موڑ سکتا تھا۔ ان کی تو ساری سیاسی زندگی حقائق کی منطق پر کھنے میں گزری۔ وہ پاکستانیوں خصوصاً نوجوان پاکستانیوں کو فکری بے اعتمادی کی راہ پر کبھی لگنے نہ دیتے۔ ان کے شب و روز اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ صداقت ایمان کو خلوص کی سچائی میں ڈبو کر عمل میں ڈھالتے رہے تاکہ یہ مملکت آسودہ حال ہو۔ ایسا قائد کب پسند کرتا کہ پاکستان میں فکر کسی واضح مقصدِ حیات کے حوالے کے بغیر پرورش پاتا رہے۔ احساس میں دیانت نہ رہے اور عمل بے عملی کا دوسرا نام رہ جائے۔

غور کیجئے پاکستان میں فکری بے اعتمادی خلوص کی مفلسی کا باعث بنی ہے۔ اسی لئے ایسے ماحول کی کوکھ سے حیات آفریں سرگرمیوں نے کم ہی جنم لیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ یہاں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کا کام گھر اور مدرسے پوری تندہی سے کریں اور دیگر سماجی، فلاحی، سیاسی اور نشریاتی ادارے بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں تاکہ ہم اپنی منزل کو پا لیں۔ اگر یہ کام صرف تعلیمی [redacted] تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور صرف کتابیں ہی استاد اور والدین کا بدل ہو کر رہ گئیں یا دیگر اداروں نے اپنا رویہ نہ بدلا، تو ہو سکتا ہے تعلیمی ادارے عقل کو آزاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر خیالات بے ربط و نظام ہی رہ جائیں گے۔ یہ سانحہ بھی ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا اسے اپنے کسی سیاست دان سے پوچھ لیں۔ میں پیامبر موت نہیں بننا چاہتا۔ میں نے پچھلے سال گفتگو کے آخر میں جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، اگلہ دگو (بی زبان سے) کیا تھا کہ ہمارے ابلاغ عامہ کے کم و بیش سبھی ادارے فکر اور احساس کی تربیت میں اپنا رول پہچاننے میں (DISINTERESTED) ہیں۔ اسی لئے وعدہ کیا تھا کہ آج کی بات حیثیت تعلیمی اداروں کے حوالے سے نہ ہوگی بلکہ دیگر (NATION BUILDING INSTITUTIONS) کے حوالے سے ہوگی۔ اس کی ضرورت جوں کی توں باقی ہے۔ تعلیمی اداروں کے دریچہ تیرو ... باقی انسٹی ٹیوشنز بھی اپنی اپنی

ڈگر پر چل رہے ہیں۔ احساس ہم سب کا (الا ماشاء اللہ) خود غرضی کا نمونہ ہے اور اعمال بھی ذاتی منفعت کے بھنور سے نہیں نکلے۔ گھر، مدرسہ، مسجد (مسجد بھی تو ہمارا بہت بڑا تعلیمی و تربیتی مرکز ہے) اخبار، ریڈیو، ٹی وی یا اسی نوع کے دیگر ادارے مل کر کوشش نہ کریں گے تو حکیم الامت کے الفاظ میں زمانہ کی ہوا کا رخ تبدیل نہ ہوگا۔ یہاں کی ہر چیز خام ہی رہے گی؟ یوں ہی ہوا تو پاکستان میں پختہ افکار کہاں ڈھونڈیں گے کہاں پائیے گا۔ سرفروشی کو آواز کیسے دی جائے گا۔ پاکستان بنایا ہی اسی لئے گیا تھا کہ فکر و احساس کی جملہ صلاحیتوں کو پوری پرورش کیا جا سکے کہ اس میں بسنے والے کسی شخص کا سر کسی دوسرے شخص کے سامنے نہ جھکے۔ سوائے خدا کے کسی اور کو اپنا خالق اور رب نہ مانا جائے اور صرف اسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نصب العین کے حوالے سے جس طور ہم نے اپنے تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا تھا اور ان کے حوالے سے جس انداز میں دیگر نفسیاتی عوامل کا تجزیہ کیا گیا تھا اسی طرح آج کی نشست میں ان عناصر پر کما حقہٗ بات چیت نہ ہو سکے گی جو اپنے تئیں اور اپنے طور پر یا پبلک ادارے میں متحرک ہوتے ہیں اور فکر و احساس کو متشکل کرتے ہیں اس کے کئی اسباب ہیں۔ مثلاً یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی تھی کہ اس سال کنونشن نومبر میں نہیں، اکتوبر میں ہو رہی ہے۔ تین چار روز پہلے جب یاد دہانی کرائی گئی اور بھائی[1] نے وعدہ یاد دلایا جو اس بھری محفل میں کیا تھا تو بے حد شرمندگی ہوئی۔ پہلے سوچا معذرت کر لوں۔ پہلا ردّ عمل یہ تھا کہ کچھ نہ کر سکوں گا۔ پھر خیال آیا کہ بات فکر اور احساس کی تربیت کی ہے۔ تم اس محفل کے مقروض ہو۔ بہت کچھ لے چکے ہو یہاں سے۔ کچھ تو قرضہ اتار دو جو کچھ سیکھا ہے اس کا کچھ حصہ تو اوروں میں بانٹ دو جس طور ہم یہاں پاکستان میں فکر کی تعلیم چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ خدا نے جو صلاحیت تمہیں دی ہے اسے اپنی اور دوسروں کی تربیت اور بھلائی کے مصرف میں لاؤ۔ اطاعت خداوندی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ لہٰذا اپنے فکر اور احساس کی تربیت کے لئے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ دوسرے میں آج بات چیت کرنے سے اس لئے بھی گھبرا رہا تھا کہ میں اپنے وقت کو صحیح طور پہ استعمال میں نہ لا سکا تھا۔ عدیم الفرصتی کا عذر تو پیش نہ کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا پلان تو یہ تھا کہ گذشتہ اجلاس کے بعد سے اپنے ہاں کے معروف (SOCIO POLITICAL) اور (SOCIO POLITICAL INSTITUTIONS) اور عام سمعی بصری نشری نوعیت کے اداروں کے متعلق باقاعدہ معلومات حاصل کروں گا۔ ان کے طریق کار اور کارکردگی کا سرسری یا تفصیلی جائزہ پیش کروں گا۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ ادارے ان راہنما اصولوں کی کس حد تک پیروی کرتے ہیں جن کا ذکر ہم اپنی گذشتہ دو سالوں کی بات چیت میں تعلیمی اداروں کے حوالے سے کر چکے ہیں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکا۔ ایسا نہ کر سکنے کا ایک سبب تو یہ تھا جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ وقت کو صحیح مصرف میں نہیں لا سکا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ابھی میرا اپنا فکر اور احساس توحید کے صحیح تصور سے نا آشنا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے تو اکثر فرعونوں، قارونوں اور ہامانوں سے ڈر سا لگنے لگتا ہے۔ اگر فکر اور احساس کی صحیح تربیت ہو جائے تو سوائے خدا کے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ سچائی حق ہی کا ایک روپ

---

[1] محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ہے - خوف سے منہ چھپانے کی تفسیر نہیں - پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ گزشتہ بات چیت میں ہم نے ذہنی عمل کا تجزیہ پیش کرتے وقت (COGNITIVE)، (AFFECTIVE) اور (CONATIVE) اور تینوں پہلوؤں کے حوالے سے اپنے مقاصد کا جائزہ لیا تھا اور جانا تھا کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد و بُعد ان تینوں پہلوؤں میں عدم آہنگی کی ایک صورت ہے چنانچہ تلقین کی گئی تھی کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ہماری یہ کوشش ہونا چاہیئے کہ ہمارے دل و زبان میں ہم آہنگی ہو - قانونِ خداوندی کی رُو سے یہ بات بڑی مذموم اور قابلِ گرفت ہے کہ ایسی باتیں کہی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے - فکر اور احساس متوازن طور پر جبھی پرورش پاتے ہیں جب ذہنی عمل کی یہ تینوں سطحیں جو دراصل ایک ہی عمل کے پرتو ہیں ایک ہی لَے میں ابھریں لیکن خارجی ماحول اور داخلی محرک میں تضاد آجائے یا انفرادی سوچ اور خارجی حالات ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں، تو پھر جس (POINT OF REFERENCE) کی ضرورت پڑتی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ آج کی نشست میں جن انسٹی ٹیوشنز کے طور طریقوں اور کارکردگی کے حوالوں سے ہم فکر و احساس کی تعلیم چاہتے ہیں، میں ان کا تنقیدی جائزہ لوں - کیونکہ مختصر سی نشست میں ایسا جائزہ لینا تکلیف دہ حد تک تشنہ رہے گا - اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری اور آپ کی بات چیت آج ہونا تھی تو یقین کیجئے گا میں اس بات چیت کا آخری حصہ کسی اور طرح لکھتا - جو تجویز میں پیش کر رہا ہوں وہ صرف پیش کر کے ہی آگے نہ بڑھ جاتا - اس کا ایک خاکہ بھی پیش کرتا مجھے تو خیال تھا کہ میری اور آپ کی گفتگو ۲۵ اکتوبر دوپہر کو ہوگی - جب میں ۲۴ کی رات کو بیٹھا لکھ رہا تھا تو اس وقت مفہوم القرآن کا ۲۹ واں پارہ میرے سامنے تھا - اس میں ضروری وضاحت کے تحت یہ لکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کے سابقہ پاروں میں بالعموم اور آخری پاروں میں بالخصوص عظیم انقلاب کا ذکر آتا ہے - متعلقہ آیات پر غور و تدبیر سے ذہن تین قسم کے انقلابات کی طرف منتقل ہوتا ہے - ایک خارجی کائنات میں انقلاب، دوسرا انقلاب وہ جو قوموں کی زندگی میں رونما ہو سکتا ہے اور تیسرا وہ جس کا تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے فکر و احساس کی تعلیم اور تربیت چونکہ ہمارا موضوع ہے - اس لئے میں اس انقلاب کی بات کرتا جو قوموں کی تمدنی، سیاسی معاشی اور سماشرتی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیتا ہے - مجھے اور آپ کو یقین ہے کہ یہ انقلاب پاکستانی قوم کے اندر اسی وقت آسکے گا جب قرآنی تعلیمات پر عمل ہوگا - قرآنی تعلیمات پر اس وقت عمل ہوگا جب یہاں ناخواندگی دُور ہوگی - تعلیم عام ہوگی - قرآن مجید کی آیات کے لغوی اور مجازی دونوں معنے سمجھنے کی کوشش ہوگی - مفہوم القرآن میں ایسی آیات کو سمجھنے کے لئے، دل تک اتر جانے کے لئے ان کے مجازی معنی لئے گئے ہیں اور ہدایت کر دی گئی ہے کہ "جو کوئی ان کے لغوی معنی لینا چاہیں تو لغات القرآن یا قرآن مجید کا کوئی سا مروجہ ترجمہ سامنے رکھ لیں اور اس طرح ان آیات کا مفہوم خود متعین کر لیں ایسے شخص کو جو قرآن کے سمجھنے کی یوں بات کرے - اسے کسی فرقے کا باقی تین نمازوں یا ۹ روزوں کا پرچارک کوئی عقل کا اندھا ہی قرار دے سکتا ہے - پرویز کسی شخص کا نام نہیں - یہ ایک تحریک کا نام ہے - وہ تحریک جو قرآن کو قرآن کی اس ہدایت کی روشنی میں سمجھنے کی دعوت دیتی ہے کہ غور کرو - عقل، بصیرت سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اس پر عمل کرنے سے کس طرح معاشی سہولتوں کے دروازے کھلتے ہیں - سرداری و سرفرازی حاصل ہوتی ہے - سکونِ قلب ملتا ہے - اور

ابدی حیاتِ اخروی کی مسرتوں کا پیغام آتا ہے۔ خود خدا اس کا وعدہ کرتا ہے۔ مجھے جس بات پر زور دینا ہے وہ یہی کہ عقل و بصیرت سے کام لینے کی توفیق جبھی ملتی ہے جب فکر و احساس کو کسی نصب العین کے حوالے سے تربیت کیا جائے اور پاکستانیوں کا نصب العین ربوبیت عالمین اور خدمت خلق ہے۔

طلوع اسلام اسی دعوت کا نام ہے۔ میں اس جماعت کا رکن نہیں، پھر بھی اس فورم سے بولنے کی اجازت رکھتا ہوں۔ قرآن کو سمجھنے چلا آتا ہوں۔ سمجھ کر بات چیت کی جسارت کرتا رہتا ہوں۔ قرآنی احکام کی روشنی میں فکر اور احساس کی تربیت کے یہی دستور ہیں کہ خدا کی دی ہوئی عقل و سمجھ کو اپنی اور دوسروں کی بہتری کے لئے استعمال کرو۔ جمہوری ملک میں بات چیت سے ہی بہتری کی صورتیں نکلا کرتی ہیں۔ فرعونیت اور قارونیت کو مرتے ہم دیکھ چکے ہیں۔ "ہامانیت" کی زبوں حالی بھی ہم سے چھپی نہیں۔ لہٰذا تحریک طلوع اسلام، میری مانئے تو ایسے نادانوں کو خاطر میں ہی نہ لائے۔ کیونکہ ایسا کرنا بھی ایک طرح سے حکم خداوندی کی بجا آوری ہے۔ کھلی ہوئی گمراہی کا مقدر تباہی ہے۔ طلوع اسلام کی تحریک کے مخالفوں کو خدا کے حوالے کریں اور خود نظام ربوبیت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہوئے رشد و ہدایت کی راہ چلتے جائیں۔

اس ضمنی بات کے بعد میں پھر اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اس سلسلہ میں بہتر یہی دکھائی دیتا ہے کہ میں ان چند صفات کا ذکر کر دوں جو پاکستانیوں کو ان کا تشخص دیں گی اور ان چند قدروں کا بیان ہو جائے جو پاکستانیوں کے فکر اور احساس کی بہ حیث القوم تربیت کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ پھر ان صفات اور قدروں کی روشنی میں ہم اپنے آپ سے سوال کریں گے کہ ہمارے ادارے کیا تصویر کے اسی رُخ کو پیش کرتے ہیں جس میں پاکستانیوں کی ذات کذب بکھرتی ہے؟ پاکستانی اپنا تشخص اسی وقت پا سکیں گے جب وہ اپنے اعمال کے آپ محاسبہ ہوں گے اور اپنے خلاف آپ شہادت بننے کی جرأت ایمانی رکھیں گے۔ جب تک احساس اور فکر کی یوں تربیت نہ ہو سکے گی پاکستانی ادارے خدا کو بھولے رہیں گے اور جو لوگ اپنے کاروبار، اپنے لیل و نہار میں اللہ کو بھول جاتے ہیں انہیں اپنی حدود کا احساس نہیں رہتا۔ وہ اپنے آپ کو وہ کچھ سمجھنے لگتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے۔ وہ اپنی قوت اور اپنے اختیارات کا غلط اندازہ کرنے لگتے ہیں اور یوں ظلم اور ناانصافی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور یہ فیصلہ قرآن کا ہے کہ قومیں خود اپنے اوپر ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں۔ ان تصریحات کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے وہ ادارے جو ہم پاکستانیوں کے فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کر سکتے ہیں ان کے رول کا تنقیدی جائزہ (CRITICAL ANALYSIS OR APPRECIATION) اس نشست میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اس کے لئے سوال و جواب کی محفل منعقد ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اگر پرویز صاحب قبول کریں تو میری تجویز یہ ہو گی کہ اگلے سال اس موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد کیا جائے جس میں ہو سکے تو ان اداروں سے متعلق اصحاب کو بھی مدعو کیا جائے اور نوجوان پاکستانیوں کو ان سے تبادلہ خیال کی اجازت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس مذاکرہ میں بھی ہم اپنی سنجیدہ روایات کو برقرار

رکھیں گے۔ جو قدریں نیکی گنوانے والا ہوں اور جو صفات صحت مند فکر اور احساس سے وجود میں آتی ہیں وہ میں نے قرآن کے اس تھوڑے بہت مطالعے سے لی ہیں جو میں نے کیا ہے۔ ترجمے اور مفہوم کے سلسلے میں نے پرویز صاحب کے مفہوم القرآن اور بلگرامی صاحب کے فیوض القرآن سے استفادہ کیا ہے۔

احکام خداوندی کا اتباع۔ یہی ہے وہ بنیادی اصول جن پر ہر پاکستانی کے فکر اور احساس کی عمارت استوار ہوگی۔ ظاہر ہے جس کا اتباع ہوگا اس کے سامنے جواب دہ بھی ہونا ہوگا۔ اس حوالہ سے روزِ قیامت کا تصور فکر اور احساس کی تربیت کرے گا۔ انسان کا انسان ہونے کی جہت سے برابر ہونے کے باوجود ان کی باہمی فضیلت کا معیار ابھر کر سامنے آئے گا۔ مصائب میں استقامت سے ذات میں بالیدگی اور اجر کا انداز سمجھ میں آئے گا۔ اوچھے پن سے اجتناب احساس میں گہرائی پیدا کرے گا۔ نخوت و تکبر میں لوگوں سے بے رخی سے احتراز فکر اور احساس میں کھوکھلا پن دور کرے گا۔ رفتار اور گفتار میں میانہ روی برتنے سے خود پسندی سے نجات کی راہ کھلے گی۔ غرضیکہ فکر اور احساس کی پاکستان میں صحیح تربیت اسی وقت ہوگی۔ جب ہر ذریعہ تعلیم یہ درس دے گا کہ صرف ایک خدا کے اقتدار اور قانون کو تسلیم کرو اور ہر آن ہر سمت سے یہی آواز آئے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم تسلیم کرنا اپنے پاکستانی تشخص کو کھونا ہے۔ ہم اپنے پاکستانی ہونے کا حق تبھی ادا کریں گے۔ جب ہم ہر ایک سے عدل کریں۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دے دیں جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کو پورا کر دیں خواہ اس کے لئے اس کے حق سے زیادہ دینا پڑے۔ عدل و احسان کی ابتداء اپنے قریبیوں، اہل خاندان اور آس پاس کے لوگوں سے کریں تاآنکہ اس کا سلسلہ عالمگیر ہوتا جائے بخل سے بچیں۔ مال کو بے جا بھی صرف نہ کریں۔ اپنا عہد پورا کریں۔ ماپیں تو پورا پورا ماپیں، تولیں تو پورا پورا تولیں۔ نہ کسی سے واجب سے زیادہ لیں اور نہ کسی کو اس کی محنت سے کم دیں۔ تحفظ عصمت کو جان سے زیادہ عزیز سمجھیں۔ اپنے ہم وطنوں کی خدمت کے لئے شاخ ثمردار کی طرح جھکے رہیں۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکیں خواہ بے حیائی کھلی ہوئی ہو یا پوشیدہ مختصر یہ کہ ہم میں سے ہر شخص دوسرے شخص کے لئے نمونہ بن جائے۔ یہ اسی وقت ہوگا جب گھر، تعلیمی ادارہ، تفریحی مراکز اور دیگر پبلک ادارے فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت، اسلام کی ابدی، اخلاقی، معیشتی، معاشرتی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی قدروں اور اصولوں کے تحت کرنے کی سعی میں کامیاب ہو جائیں۔ سر دست صرف مدرسہ کو اس کا مرکز سمجھا جاتا ہے معاشرے کے دیگر ادارے قدم قدم پہ استاد کا منہ چڑاتے محسوس ہونے لگتے ہیں جواب میں اکثر و بیشتر استاد بھی معاشرے کے انہی اداروں میں شامل ہو گیا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنے فکر اور احساس کو اس کی مقرر کردہ اقدار کی حفاظت کے لئے سرگرم عمل ہونے کی توفیق دے تاکہ ہمارا شمار بھی ان خوش بخت قوموں میں ہو جن کے سب کام سنورتے رہتے ہیں۔ آمین

طلوع اسلام کنونشن اکتوبر ۱۹۶۴ء

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ ——— ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء ——— بروز ہفتہ

موضوع مذاکرہ:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بہ صدارت: محترم شیخ سراج الحق صاحب سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ لاہور

شرکائے مذاکرہ (حسب ترتیب شرکت)

۱ خالدہ سرور (جماعت ششم)
۲- راشد اقبال (جماعت ہفتم)
۳- سلمیٰ لطیف (جماعت نہم)
۴- صالحہ فخمی (طالبہ بی۔ ایس۔ سی)
۵- راحیل اکبر (میڈیکل کالج۔ بہاول پور)
۶- توصیف احمد خان (فرسٹ ایئر۔ کوئٹہ)
۷- ثریا عندلیب
۸- محمد فیروز طاہر۔ ملتان (طالب علم ایم۔ اے)
۹- نیاز محمد خاں (کوئٹہ)
۱۰- محمد احمد (ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)
۱۱- مس شمیم انور (لیکچرر) انگریزی میں مقالہ
۱۲- نجیبہ فاروقی (طالبہ۔ ایم۔ اے)
۱۳- عارفی سلطانہ (مسز گونہ ایم اے)
۱۴- گوگی (کم سن طالب علم)
۱۵- رانی (کم سن طالبہ)
۱۶- نجمہ صفدر (بی۔ اے)
۱۷- سلمیٰ پرویز (ایم۔ اے)

افتتاحیہ از جناب صدر

میرے بھائیو اور بہنو!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے - اس دفعہ ہمارے مذاکرے کا موضوع ہے -

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس سلسلے میں ہمارے مروجہ نظام تعلیم کی خرابیوں اور اس کی پیدا کردہ تباہیوں پر ہمارے بچے جو ابھی آپ کے سامنے آکر اپنے مقالے پڑھیں گے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اس موضوع پر روشنی ڈالیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کے مقالے کا منتہی یہی ہوگا کہ ان خرابیوں کا علاج اس درسگاہ کے سوا کچھ نہیں جس کی تجویز طلوع اسلام کی طرف سے ہوتی چلی آئی ہے - اس مقام پر فطری طور پر آپ احباب یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوں گے کہ مجوزہ درسگاہ کی سکیم کا کیا بنا؟ اس سلسلے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اسے میں بحیثیت سکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کنونشن کے اجتماعات میں ہر سال پیش کرتا چلا آیا ہوں - پہلا مرحلہ زمین کے حاصل کرنے کا تھا - ہم سنتے تو چلے آرہے تھے کہ نوع انسانی کے لئے زمین کا مسئلہ بنیادی ہے اور اس کا حل بہت مشکل - ہمیں اس کا عملی تجربہ اب جا کر ہوا ہے - ذرا سوچئے کہ زمین موجود ہے - بیچنے والے فروخت کے لئے آمادہ ہیں - خریدنے والوں کے پاس قیمت خرید موجود ہے - حکومت کی مشینری بطور نگہبان موجود ہے کہ کہیں کوئی دھوکا نہ دے جائے - یہ سب کچھ موجود ہے - لیکن زمین ہے کہ قابو میں نہیں آنے پاتی - تفصیل اس داستان کی طول طویل ہے - اس کا آخری مقام آج یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے زمین کی قیمت جو دوبارہ مقرر ہوئی ہے وہ اس اندازہ سے زائد ہے جو پہلے لگایا گیا تھا - جس زائد رقم کا ہم سے اب مطالبہ کیا گیا ہے ہمیں امید ہے کہ چند دنوں تک یہ بھی ادا کر دی جائے گی اور اس کے بعد توقع ہے کہ دو ماہ کے اندر پوری زمین کا قبضہ ہمیں مل جائے گا - جی بہت چاہتا تھا کہ زمین کا قبضہ ہمیں اس کنونشن سے پہلے مل جاتا اور کچھ نہیں تو کم از کم کنونشن میں شرکت کرنے والے احباب سجدہ شکرانہ کی نماز وہاں جا کر ادا کر آتے - لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا - میں اس وقت آپ سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب ہم آئندہ سال کنونشن میں جمع ہوں گے تو اللہ کے فضل و کرم سے آپ کی قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے قبضہ میں مجوزہ سکیم کے لئے زمین بھی مہیا ہو چکی ہوگی اور عمارات کے سلسلہ میں عملی اقدامات بھی ہو چکے ہوں گے اس کے لئے میں ابھی سے آپ کو دعوت دینے کی سعادت حاصل کرتا ہوں -

اب آپ سنئے بچوں کے مقالات :-

۱- خالدہ سدوس

پیارے باباجی، جناب صدر و محترم بزرگان!

السلام علیکم!

جب میں آج کے مذاکرہ کا عنوان پڑھتی ہوں اور [illegible] کا تعلیمی ماحول دیکھتی ہوں، تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگرچہ فرعون اپنے وقت کا لاکھ خدا بن بیٹھا تھا لیکن [illegible] جو ترکیب بنی اسرائیل کے بچوں کو ختم کرنے کے لئے

اختیار کی۔ اس سے تو وہ بہت نادان اور احمق معلوم ہوتا ہے۔ اس خوف سے کہ حضرت موسیٰؑ پیدا نہ ہوں اور اس کی ذات کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ وہ بچوں کو قتل کرواتا رہا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ حضرت موسیٰؑ بھی آکر رہے۔ ان کے ہاتھوں اس کی ساری خدائی ملیامیٹ ہوئی اور بچوں کے قتل کا کلنک ماتھے پر الگ لگا۔ اس کے نجومی اور عاقلوں کے تمام لاؤلشکر اسے اس قوم کی ہستی کو دبانے اور فنا کرنے کی اس سے مؤثر ترکیب نہ سمجھا سکے۔ اِدھر اپنے غیر ملکی آقاؤں کی فرعونی قوت کو دیکھئے۔ انہوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایسی مؤثر تدبیر کی اور ایسا مہذب دام بچھایا کہ ستائیس برس ہو گئے۔ ہم نے ان کی سیاسی غلامی کے جوئے کو بھی کندھوں سے اتار پھینکا۔ لیکن اس جال سے آج تک رہائی نہ پا سکے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بے بسی سے اس میں پھڑپھڑا رہے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ ہمارے وہ آقا ہمارے قاتل نہ ٹھہرے۔ بلکہ ہماری پسماندہ قوم کو علم و فن، تعلیم و تہذیب اور بڑی بڑی درس گاہیں عطا کرنے والے محسن کہلائے۔ جس دور میں یہ شعر کہا گیا تھا۔ اس زمانے میں ان کالجوں اور درس گاہوں سے تیار ہو کر نکلنے والے ذہن اور کردار شاید اتنے مسخ شدہ نہ ہوں جتنے اس دور میں ہیں۔ لیکن اس "دیدۂ بینائے قوم" نے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر یقیناً دیکھ لی تھی جس نے اُسے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ:-

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

جب فکر و عمل اور انسانی ذات کی تعمیر کرنے والے ہر عنصر کو چھانٹ چھانٹ کر تعلیمی ڈھانچے سے الگ کر دیا جائے تو پھر اس تعلیم سے منور ہونے والے ذہن لازماً وہی چراغ ہوں گے جن سے خود گھر کو آگ لگ جایا کرتی ہے۔ اس تعلیم نے خودسری، بے باکی، اعلیٰ اقدار کی پامالی۔ انتشار اور بدنظمی کے جو خنجر ہمارے ہاتھوں میں دے دئے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو ہمارا قاتل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان چیزوں کے جو جو مظاہرے آپ کی تجربہ کار نظروں سے گزرے ہوں گے۔ وہاں تک میری کم سن نگاہوں کی بھلا کب رسائی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی جو کچھ میرے محدود تجربے میں آتا ہے میں اس پر ہی محوِ حیرت رہتی ہوں۔

ابھی تھوڑے ہی عرصہ کی بات ہے جب گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوبارہ سکول کھلے تو سُنا گیا کہ پندرہ دن پڑھائی نہیں ہوگی بلکہ سوشل ورک ہوگا۔ اب اس سوشل ورک نے کیا کیا گل کھلائے "ہم جو کہہ دیں تو شکایت ہوگی"۔ لیکن پھر بھی ایک دو واقعات تو میں دُہرائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارے سکول کی آٹھویں جماعت کی طالبات روشندان صاف کر رہی تھیں۔ کوئی لمبی سیڑھی میسّر نہ تھی۔ ایک بڑے میز پر ایک چھوٹا میز رکھا گیا۔ اس پر ایک اور میز، اور اس پر ایک کرسی رکھ کر ایک بچی بیچاری روشندان صاف کرنے کے لئے اوپر چڑھی۔ وہ روشندان صاف کر رہی تھی اور کچھ نے دل بہلانے کے لئے نیچے سے میز ہلانا شروع کر دیا۔ وہ ڈری۔ چیخی۔ لیکن ان کا یہ شغل جاری رہا۔ منع کرنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ آخر وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بچی گری اور اس کا پیٹ پھٹ گیا۔ پہلے پیدل اسے پاس کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ وہاں سے ہسپتال پہنچایا گیا لیکن ان کی دل لگی اس کی جان لے کر رہی۔

وہاں سے سہمی ہوئی میں اپنی چھوٹی بہن کو جو جماعت سوم کی طالبہ ہے۔ پرائمری سکول میں لینے گئی۔ وہاں بھی یہی قصہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے لمبی لمبی گھاس اُکھیڑ رہی تھیں اور کانٹے

چھٹی ہی تھیں۔ پاس سکول کی مائی بڑا سا ڈنڈا لئے کھڑی تھی، جو بچی تھک کر بیٹھتی۔ مائی کمر میں ایک ڈنڈا جڑ دیتی۔ ایک بچی کے پاؤں میں کانٹا چبھا۔ اس نے آدھ سیکنڈ تاخیر کی۔ غصہ اتارنے کے لئے پاس پڑی ہوئی اینٹ اٹھا کر دوسری کے سر میں دے ماری۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون کی دھار بہنے لگی۔

ممکن ہے ان واقعات کو بچپن کی بھول کہا جائے۔ لیکن جب اٹھان انہی خطوط پہ ہوگی تو نتائج بھی یہی ہوں گے خواہ بچے عمر اور تعلیم میں کتنے بڑھتے جائیں بلکہ اس قسم کی تعلیم پڑھنے کے ساتھ ساتھ نتائج اس سے بھی بھیانک تر ہوتے جائیں گے اور آپ کو خود اس بات کا شدید احساس ہے۔ یہ جو آئے دن یہاں سے کبھی یہ پکار سنائی دیتی ہے کہ

ع "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ:

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

تو یہ سب اسی احساس کی بازگشت ہے۔ اب سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ آخر اس "درد کی دوا کیا ہے؟"

میری اتنی بساط کہاں کہ یہ دوا بتا سکوں۔ آپ بزرگان سے ہی سنا ہے کہ اس قسم کے غلط تعلیمی نظام کے زہر کا تریاق وہ درسگاہیں ہیں جن میں قرآنی تعلیم کو اس طرح طالب علم کے ذہن و عمل میں بسا دیا جائے گا کہ وہ:

"قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن"

کی تفسیر بن جائے۔ پھر ہی وہ سحر طلوع ہوگی جب زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔"

مدت سے ہمیں اس قسم کے ایک کالج کی خوشخبری دی جا رہی ہے۔ اگرچہ ابھی پچھلے سال ہی ہمیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ "نہ ہو نومید" لیکن اس کے باوجود میں جاتے جاتے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی کہ وہ سحر کب۔ آخر کب طلوع ہوگی۔ جب ایسے کالج ہمیں ملیں گے؟ شکریہ۔ والسلام

۲۔ راشد اقبال۔ ملتان

صاحب صدر، محترم باباجی و معزز سامعین

السلام علیکم!

"یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی"

اس عنوان کو قائم کرنے والے سب بڑے یعنی بڑی عمر کے ہیں اور انہوں نے کالج ہی کو موضوع بنایا ہے۔ حالانکہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں اکبر الٰہ آبادی سے معذرت کے ساتھ عرض کروں کہ:

"یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو سکول کی نہ سوجھی"

میں نے کالج کو سکول اس لئے کہا ہے کہ میں ابھی تک کالج نہیں گیا اور سکول میں ہی ہوں۔ اگر بچوں کو سکول ہی میں قتل کر دیا جائے تو کالج کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جو کچھ آج کل کورس میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس سے تو آپ سب لوگ واقف ہی ہوں گے۔ میں آپ کو اپنے سکول کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے سکولوں میں دانستہ یا نادانستہ طور پر بچوں کو کس طرح زہر پلایا جا رہا ہے۔

"ایک دن ہم کلاس روم میں بیٹھے تھے کہ ہمارے اسلامیات کے ماسٹر صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی۔ انہوں نے کہا "جو لڑکے سنی ہیں وہ کھڑے ہو جائیں کچھ لڑکے کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا "جو لڑکے شیعہ ہیں وہ بھی کھڑے ہو جائیں"۔ اور پھر کچھ لڑکے کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح مختلف فرقوں کے نام لے لے کر وہ لڑکوں کو علیحدہ کرتے رہے۔ آخر میں صرف میں بیٹھا رہ گیا۔ ماسٹر صاحب حیران ہوئے اور انہوں نے کہا "بھئی میں نے تو سب فرقے گن دئے۔ تم کس فرقے سے تعلق رکھتے ہو۔ تم ہی بتاؤ"۔ میں نے کہا "جی میں مسلمان ہوں"۔ اس کے جواب میں ماسٹر صاحب نے اور تو کچھ نہ کہا۔ بس اتنا کہا۔ "اچھا اچھا، سب بیٹھ جاؤ"۔

اس ایک واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے ذہنوں میں کس قسم کا زہر ملایا جا رہا ہے۔ اب پھر میں عنوان کو معذرت کے ساتھ دہراتا ہوں کہ :-

افسوس کہ فرعون کو سکول کی نہ سوجھی — یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

والسلام

۳۔ سلمٰی لطیف

السلام علیکم!

آج سے ۷۰ سال پہلے اکبر الٰہ آبادی نے کالج کو مقتل سے تعبیر کیا، تو قوم نے انہیں نبض شناس امراضِ ملت کہا۔ مگر آج میں اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر پڑھ تو ضرور سکتی ہوں لیکن سلیبس اردو میں اس کی تشریح نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں کہ تعزیراتِ پاکستان میں کوئی ایسی دفعہ ضرور ہو گی جس کے تحت نظامِ تعلیم پر تنقید کرنا قابلِ دست اندازی پولیس نہیں تو قابلِ مواخذہ ضرور ہو گا۔ تاہم :-

کہوں گی سچ اگرچہ جانتی ہوں — سچائی کی سزا دار و رسن ہے

ہمارے ہاں ایسے قوانین ضرور ہیں جنابِ صدر! جن کے تحت کسی جانور پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ لادنا جرم ہے۔ اس قسم کا قانونی تحفظ ایک گدھے کے بچے کو تو عمر بھر کے لئے حاصل ہے۔ لیکن انسانی بچہ اس حق سے اسی دن محروم ہو جاتا ہے جس دن وہ سکول کا رُخ کرتا ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے بچے کا دوسری جماعت کا بستہ تول کر دیکھ لیجئے۔ میرا اپنا چھوٹا بھائی ایک ماڈل سکول کی دوسری جماعت کا طالب علم ہے ہمارے ہاں دوسری جماعت کے طلبا کی عمر پانچ چھ سال سے زائد نہیں ہوتی۔ ا۔ ب۔ آ۔ ج، ا۔ جا کی گھاٹی عبور کرنے کے بعد یہ بچے دوسری جماعت میں قدم رکھتے ہیں، تو جن مضامین سے انہیں واسطہ پڑتا ہے۔ ان کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) اردو (۲) انگریزی (۳) ریاضی (۴) سائنس (۵) دینیات (۶) معاشرتی علوم (۷) فنونِ عملی، آرٹس۔

کل ہوئے صرف سات مضامین۔ ان مضامین کے علاوہ بچہ خود چاہے تو بینڈ وغیرہ میں حصہ لے سکتا ہے۔

تعلیم چونکہ بالکل مفت ہے۔ اس لئے ان مضامین کی تیاری کروانے کی تمام تر ذمہ داری والدین پر ہے سکول ازراہِ کرم والدین کو سہ ماہی رپورٹوں کے ذریعے بچے کی خامیوں سے آگاہ اور اپنے ماہرانہ مشوروں سے مستفید کرتا رہے گا۔ تاکہ بچے کو پڑھانے میں والدین کو دقت نہ ہو۔ اگر والدین خود ایسا نہ کر سکیں تو ٹیوشن کی رقت کے عوض

ہوگا۔ جس کی ناقابل واپسی فیس چالیس، پچاس روپے ماہوار سے کم نہ ہوگی۔ اس طرح والدین کی محنت کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی بچے کو صرف حروف تہجی سکھانے پہ تقریباً ۷۰۰ روپے لاگت آتی ہے۔ گویا ایک حرف کی اوسط فیس ہوئی چوبیس روپے پچانوے پیسے۔ تعلیم گویا مفت!

یہ ہے جناب صدر تعلیم کا وہ عملی پہلو جو ہمارے یہاں کم و بیش سبھی درس گاہوں میں رائج ہے اور اس طرح تعلیم کو آسان، سستی اور قابل حصول بنانے میں عوامی حکومت کی کوششوں کو جو تقویت پہنچتی ہے۔ اس پر محکمہ تعلیم مطمئن ہی نہیں، مسرور بھی ہوگا۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے جناب صدر، میرے پاس اس کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ میرے ہاتھ میں اس وقت دوسری جماعت کے چھٹیوں کے کام کی فہرست ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔ ہمارے ہاں اپریل کا مہینہ داخلوں اور مئی کتابیں خریدنے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جون میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں اور اس طرح عملی طور پہ تدریسی کام اگست ہی میں شروع ہو پاتا ہے لیکن نئی جماعت کے نصاب کا ایک لفظ پڑھائے بغیر بچوں کو جس تیاری کا حکم دیا جاتا ہے اس کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حساب

۱۔ صفحہ ۱ سے صفحہ ۷۷ تک سوالات کاپی پر حل کرنے۔

۲۔ دو سے ۱۲ تک پہاڑے زبانی یاد کرنے (باقی کچھ نہیں بچا)

۳۔ ایک سے سو تک الٹی گنتی لکھنی (لکھ کر دکھائیے)

(۲) اردو

۱۔ ستادن صفحے تک کتاب پڑھنی اور پانچ نظمیں زبانی یاد کرنی۔

۲۔ ہر کہانی میں سے پانچ الفاظ کے معنی لکھنا اور جمع بنانا۔

(۳) سائنس

سارے کا سارا نصاب زبانی یاد کرنا (شکر ہے ایٹم بم بنانا اس میں شامل نہیں)

(۴) دینیات

۱۔ سورۃ اخلاص، سورۃ کوثر مع ترجمہ یاد کرنا۔

۲۔ ماں، باپ۔ استاد۔ بڑوں کا ادب اور قرآن کی تعلیم یاد کرنا (الحمدللہ)

(۵) معاشرتی علوم

۱۔ معاشرے کے کارکنوں کے فرائض۔ سفر کے ذرائع۔ موسم۔ موسم کی سبزیاں اور لباس۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے فوائد یاد کرنا۔

(۶) فنون عملی، آرٹس

۱۔ فہرست بہت طویل ہے۔ اتنا یاد ہے کہ ہم سب بہن بھائی مل کر بھی فن کا مطلوبہ مظاہرہ نہ کر سکے۔ اور نہ ہی ... ... کہتے کیسے ہیں۔

عے انگریزی

صفحہ ۳ سے صفحہ ۲۴ تک مع ترجمہ یاد کرنا۔ اور ہر کہانی کے پانچ الفاظ کے معنی لکھنا اور جمع بنانا

بطور یاد دہانی پھر عرض کر دوں کہ یہ تحریری حکم نامہ ان بچوں کے لئے ہے جنہوں نے ابھی دوسری جماعت میں قدم رکھا ہے اور جنہیں الفاظ تو ایک طرف ابھی حروف تک کی بھی پہچان نہیں۔ اور یہ کام جو پورے نصاب پر محیط ہے سارے سال میں نہیں صرف ان دو ماہ میں کرنا ہے جنہیں ہم آپ چھٹیاں کہتے ہیں۔

ان چھٹیوں کے فوراً بعد ایک ٹیسٹ رپورٹ والدین کو پہنچائی جاتی ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہوتے ہیں۔

"بچہ فلاں فلاں مضمون میں فیل یا کمزور ہے۔ مزید توجہ دی جائے"

پہلی بات تو یہ اہم الفاظ پر مشتمل یہ تحریری حکم نامہ ہے ہی والدین کے لئے۔ کیونکہ دوسری جماعت کا بچہ اس ٹائپ شدہ حکم کی ایک لائن بھی نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری یہ کہ یہ سب کچھ اگر والدین ہی کو کرنا ہے تو کس مرض کی دوا ہیں یہ درسگاہیں۔ اور کیسی ہے یہ تعلیم جس کا ایک طالب علم کی ذہنی سطح سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے جنابِ صدر! کہ ہم ان درسگاہوں میں جاتے ہیں تو صرف اس لئے کہ عمر بھر کی جگر کاویوں کے بعد ہمیں کاغذ کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے جسے اصطلاحاً سند، ڈگری یا ڈپلومہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ملازمتوں کا تمام تر انحصار، چونکہ کاغذ کے اسی بے جان ٹکڑے پر ہے۔ اس لئے چار و ناچار ہم ان درسگاہوں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ ورنہ جو کچھ ان درسگاہوں میں پڑھایا یا سکھایا جاتا ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو اپنے میٹرک پاس بچے سے کہیئے کہ وہ نوکری کے لئے ایک درخواست ہی لکھ دے۔ یا اپنے اس بچے کو جو پولی ٹیکنیک ادارے سے تین سال کا ڈپلومہ لے کر آیا ہے کہیئے کہ آپ کے ٹی وی سیٹ میں ایک فیوز ہی لگا دے۔ ملازمتوں کیلئے شرطِ عملی کارکردگی مقرر کر کے ڈگریوں کا تصور ختم کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی یہ درسگاہیں کتنے دن آباد رہتی ہیں۔

ہاں! تو میں بچے کی ذہنی سطح کا ذکر کر رہی تھی۔ ایک دوسری جماعت کے بچے کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس طالب علم کو بھی چھوڑ دیئے۔ اسی حکم نامے میں انگریزی مضمون کے نیچے لکھا ہے "دس پرندوں، دس جانوروں، دس رنگوں دس پھلوں اور دس سبزیوں کے نام یاد کرو۔"

آپ حضرات میں بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور ڈاکٹر حضرات بھی ہوں گے۔ ہیں کوئی صاحب جنہیں دس رنگوں کے نام تو کجا دس سبزیوں کے انگریزی نام بھی معلوم ہوں۔ اور اگر یہ سب کچھ دیکھ کر اکبر کہتا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

تو وہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ لیکن یہ تو اس نے ساٹھ سال پہلے کہا تھا۔ وہ اگر آج زندہ ہوتا تو ؎

کیا جانئے کیا کہتا، کیا دیکھتا، کیا کرتا

اچھا ہوا وہ آج سے بہت پہلے دنیا سے چلا گیا!

شکریہ

۴۔ صالحہ نغمی

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

صدرِ گرامی اور حاضرینِ کرام

رحمت و سلام

آپ سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے خوب واقف ہیں کہ "علم حاصل کرو خواہ تمہیں اس کے لئے چین جانا پڑے" آپ اس حدیث مبارکہ کے مفہوم اور اہمیت اور افادیت سے بھی پوری طرح باخبر ہوں گے تو پھر سن لیجئے کہ حضور کے اس فرمان پر عمل پیرا ہونے کی بدولت میں ایک نہایت قابلِ تنظیم اور لائقِ تحسین ہستی ہوں۔ میں جو اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کو علم کے انمول زیور سے آراستہ کر رہی ہوں۔ میں جو دن کا ایک چوتھائی حصہ اپنی درس گاہ میں اور اس کے علاوہ کچھ وقت اپنے گھر پر حصولِ علم میں صرف کر دیتی ہوں۔ یہ میری ایک نہایت قابلِ قدر اور مستحسن کوشش ہے جو میری زندگی کو سنوارنے اور شخصیت کو نکھارنے کے علاوہ میری قوم کے درخشندہ و تابندہ مستقبل کی ضمانت بھی ثابت ہو سکتی ہے! لیکن میری صلاحیتوں اور کاوشوں کا اعتراف اور تعریف کئے جانے کے بجائے مجھے میری کوششوں کا کیا صلہ دیا جاتا ہے؟ میری راہ میں ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں اور ہر گام پر نئی نئی مشکلات میرا منہ چڑاتی ہیں۔ آئیے حاضرینِ! اب ایک طالبہ علم آپ کو اپنی مشکلات اور تکالیف کے آئینے کا ایک ایک رُخ دکھاتی ہے کہ شاید آپ کو اپنے اعمال کی چند جھلکیاں اس آئینے میں بھی نظر آجائیں۔

صدرِ محترم! حصولِ تعلیم کے لئے میں روز صبح اپنی درس گاہ پہنچنے کے لئے تیار ہو جاتی ہوں لیکن سب سے پہلے تو یہیں ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے سکول یا کالج کیونکر پہنچوں! میں ایک مسلمان معاشرے کی ایک مسلمان بیٹی ہونے کے باوجود بلا خوف و خطر درس گاہ نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس معاشرے میں کسی زیور سے لدی پھندی خاتون کو تن تنہا صحرا میں سفر کرنے کی جرأت ہونا تو کجا۔ کسی طالبہ کو سادہ لباس میں سڑک تک پر سے تنہا گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو مجبوراً اپنی جان اور عزت خطرے میں ڈال کر کرتی ہے کیونکہ یہاں اس کو قدم قدم پر اپنے مسلمان بھائیوں کی طرف سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس وجہ سے میں ذاتی موٹر اور ڈرائیور نہ ہونے کی صورت میں کبھی ادنیٰ بس کبھی منی بس اور کبھی کسی اور ذریعے کا سہارا لیتی ہوں۔ اور ایسے میں بھی لاشعوری طور پر ایک خوف مجھے دامن گیر رہتا ہے۔ اور سامعینِ کرام! کیا بس مجھے بہت آسانی سے مل جاتی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب تفصیل سے دینے پہ آجاؤں تو روزمرہ کے تکلیف دہ تجربات و مشاہدات سے بھرپور اک داستاں ہوگی جسے سنا کریں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں! یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ طلبا و طالبات کو صبح کے کئی قیمتی لمحات سٹاپ پر بس کے انتظار میں ضرور ضائع کر دینے پڑتے ہیں۔

کسی نہ کسی طرح میں اپنے سکول یا کالج پہنچ ہی جاتی ہوں۔ مقامِ شکر ہے کہ یہ مرحلہ ختم ہوا لیکن کیا اس کے

ساتھ ہی میری تمام مشکلات کا بھی خاتمہ ہوگیا ؟ یہاں پہنچ کر تو صعوبتوں اور کٹھنائیوں کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے :-

صدرِ محترم ! میں اپنی درس گاہ میں پڑھنے کے لئے آئی ہوں - میں یہاں آکر پڑھنا چاہتی ہوں - میں صدقِ دل سے حصولِ علم کی تمنا لے کر یہاں آئی ہوں -

لیکن کیا میرے تمام استاد مثالی استاد ہیں ؟

کیا تمام معلم اتنی اہلیت رکھتے ہیں ؟

کیا سب کے سب اتنی کوشش بھی کرتے ہیں ؟

میرے ان تمام سوالات کا جواب میں ان اساتذہ سے مانگئے جو اپنے پیریڈ میں کلاس میں بروقت نہیں پہنچتے اور گھنٹے، پون گھنٹے کے پیریڈ کا ایک چوتھائی حصہ ان کی اس دیر ہی کی نذر ہو جاتا ہے -

ان سوالات کا جواب ان معلموں سے حاصل کیجئے جو ہفتے میں ایک یا دو دن غیر حاضر ہونا اپنی عبادت بنا لیتے ہیں اور اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کرتے کہ طالب علموں کو اپنے تعلیمی سال کے آخر میں امتحان میں بھی بیٹھنا ہے !

ان باقل کا جواب ان استادوں سے بھی تو مانگئے جو کلاس میں بلا ناغہ اور بروقت موجود تو ہوتے ہیں لیکن ان کی موجودگی اور غیر موجودگی ایک برابر ہوتی ہے کیونکہ وہ طالب علموں کو اپنے خزانۂ تعلیم سے مستفیض کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہوتے ہیں - یہ استاد شاگرد کو اس کا سبق سمجھا ہی نہیں پاتے اور اس پر ان کی بات کا مطلب واضح ہی نہیں ہوتا -

آپ ہی بتائیے حاضرینِ گرامی ! کہ ایسی صورت میں طالب علم جسمانی طور پر کمرۂ جماعت میں موجود ہونے کے باوجود ذہنی طور پر وہاں سے میلوں دور تصورات کی دنیا میں کیوں نہ بھٹک رہا ہوگا - اور کسی اردو یا پنجابی فلم، کسی ٹیلی ویژن پروگرام یا کسی اور من پسند شے کے متعلق خیالات کی بھول بھلیوں میں کیوں نہ کھویا ہوگا ؟ ایسے استاد کو طالب علموں کی بے توجہی کی شکایت کرنے کا حق ہی کیا ہے پڑھاتے وقت جس کا لہجہ ہی اس قدر (BORING) ہو کہ طالب علم کو کلاس میں ہی جمائیاں آنے لگیں !

لیکن مجھے اپنے استادوں سے متذکرہ بالا سوالات کے علاوہ کچھ اور سوال بھی تو کرنے ہیں ! میں نے ان سے یہ بھی تو پوچھنا ہے کہ وہ پرائمری سکولوں کے ننھے اور معصوم طالب علموں سے اس قدر سختی اور درشتی کا سلوک کیوں روا رکھتے ہیں کہ معصوم روحیں انہیں اپنے والدین کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام ہستی یعنی ماسٹر کی بجائے (MONSTER) سمجھنے پر مجبور ہو جائیں ؟ اور استاد کے ڈنڈے کا خوف اس طرح ان کے دل و دماغ میں سما جائے کہ ان کی سمجھنے اور سیکھنے کی قوتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں - نہ تو کلاس میں استاد کا پڑھایا ہوا سبق ان کے پلے پڑ سکے اور نہ ہی وہ گھر جا کر کچھ دہرانے اور یاد کرنے کے قابل رہیں - آپ ہی بتائیے معزز حاضرین کہ ایسی صورت میں بچے کا ناپختہ ذہن مدرسے کے خوفناک ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لئے سکول سے بھاگنے کی طرف کیوں راغب ہوگا ! مجھے اپنے معلموں سے یہ سوال بھی تو کرنا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے بارہ چودہ برس کی عمر کے بچوں میں بے مصرف نفرت اور مایوسی و ناامیدی کے جذبات کیوں پیدا کر دیتے ہیں ؟ مجھ سے یہ نہ کہئے گا کہ یہ سراسر الزام تراشی ہے

کیونکہ اس کا ثبوت بھی میرے پاس موجود ہے۔ آپ یہ ثبوت مانگتے ہیں تو ایک استاد اور اس کی پچیس تیس طالب علموں کی ایک جماعت کا تصور کر لیجئے۔ استاد اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ ان پچیس تیس شاگردوں میں سے کون کتنے پانی میں ہے یعنی کون کس حد تک ذہین یا کند ذہن ہے۔ حاضرین آپ غور کیجئے کہ ہر طالب علم خواہ وہ ذہین ہو یا کند ذہن اپنے استاد پر یکساں حق رکھتا ہے اور یہ استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک پر یکساں حق رکھتا ہے اور یہ استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک پر یکساں توجہ دے بلکہ غبی شاگرد تو اس کی توجہ کا زیادہ مستحق ہوتا ہے لیکن اگر استاد صرف ہونہار شاگردوں کو ہی پسند کرتے ہوئے صرف انہیں پر توجہ دے لیکچر دیتے وقت اپنی نگاہیں زیادہ تر انہیں پر مرکوز رکھے سوالات انہیں سے پوچھے اور صحیح جواب ملنے پر شاباش انہیں کو دے اس کے برعکس کند ذہن شاگردوں کو معمولی غلطیوں پر بھی بری طرح جھڑکے اور ڈانٹے تو ہیں آپ ہی سے پوچھتی ہوں کہ ایسی صورت میں ان "نالائق" شاگردوں کے دل و دماغ میں اپنے استاد کے خلاف نفرت اور خوف کے جذبات اور ذہین شاگردوں کے خلاف حسد وجلن کے جذبات پروان چڑھیں گے یا نہیں؟ وہ دن بدن اپنی جماعت کے ماحول سے بددل ہوتے چلے جائیں گے یا نہیں اور روز بروز مایوسی و ناامیدی کے اندھیروں میں ڈوبتے چلے جائیں گے یا نہیں؟

لیکن یہ تو استاد کی ناانصافی اور بے عدلی کا صرف ایک پہلو ہے ؟ "سونے پہ سہاگہ" تو اس وقت ہوتا ہے جب استاد ایک شاگرد کو دوسرے پر ترجیح، پہلے کی لیاقت اور دوسرے کی نالائقی کی وجہ سے نہیں بلکہ پہلے کی دولت و ثروت اور دوسرے کی غربت کی بنا پر دیتا ہے۔ جس استاد کو اس کے امیر شاگرد کے دئے ہوئے تحفے تحائف اس کو امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب کرانے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ وہ بہت ہی زیادہ قابل گرفت، لائق مذمت اور مطعون و ملعون کئے جانے کے قابل ہے۔

تو پھر معزز سامعین! میں اساتذہ پر مذکورہ الزام عائد کرنے میں حق بجانب ہوں نا، جو میں نے طالب علموں کے تلخ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان پر عائد کیا ہے۔ غیر جانب داری اور منصف مزاجی ہر اچھے استاد کی خصوصیت ہوتی ہے اور (FAVOURISM) خواہ وہ کسی بھی شکل میں اور کسی بھی بنا پر کیوں نہ ہو ناقابل برداشت ہے۔

حاضرین! آپ میرے شکوہ و شکایات کے اس پلندے سے اکتا تو گئے ہوں گے لیکن ابھی تو میں نے آپ سے اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ لہذا پیشتر اس کے کہ آپ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جائے میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گی کہ

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

صدر گرامی! ابھی تو میں نے آپ کی توجہ اور بھی مسائل کی طرف دلانی ہے۔ سب سے پہلے تو یہی دیکھئے کہ جس درسگاہ میں میں زیر تعلیم ہوں، عمارتی اعتبار سے وہ کس حالت میں ہے۔ ایک طرف تو سکول، کالجوں کی نو تعمیر شدہ، مضبوط، مناسب فرنیچر سے آراستہ کشادہ کمروں اور کھیل کے میدانوں والی عمارتیں خوشحال طلبا کے لئے مناسب سہولتیں مہیا کرتی ہیں اور دوسری طرف درسگاہوں کی ایک بڑی تعداد پرانی بوسیدہ اور خطرناک چھوٹے چھوٹے کمروں اور ناکافی فرنیچر والی عمارتوں پر مشتمل ہے جو بعض اوقات بجلی کی سہولت سے بھی محروم ہوتی ہیں اور غریب و نادار طلبا کی کم مائیگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ اور اگر دیہات میں چلے جائیے تو وہاں آپ ننھے منھے بچوں کو کھلے آسمان تلے چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے اپنا مستقبل سنوارنے کی سعی کرتے ہوئے پائیں گے۔

اس پر بھی غور کیجئے، حاضرین کرام کہ میرے کالج کی سائنس لیبارٹریوں کی کیا حالت ہے۔ ناکافی سامان،

پرانے اور زنگ آلود اوزار اور خراب اور ناقابلِ استعمال آلات والی تجربہ گاہیں سائنس طلبا کے صبر کا امتحان لیتی رہتی ہیں! اور اب میری درسگاہ کی لائبریری کی طرف آجایئے۔ پہلی نظر میں آپ اس کو نسبتاً بہتر حالت میں پائیں گے کیونکہ یہاں آپ کو نصابی اور غیر نصابی کتب خاصی بڑی تعداد میں الماریوں میں سجی ہوئی ملیں گی لیکن اگر آپ ایک طالب علم کی حیثیت سے اس لائبریری کو پرکھیں تو یہ جان جائیں گے کہ یہ ضروری نہیں کہ یہاں سے اپنے مخصوص شعبے کی ایک مخصوص کتاب جس کی آپ کو ایک مخصوص وقت میں اشد ضرورت ہے، دستیاب ہو جائے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہاں کئی کتب کٹی پھٹی اور صفحات سے خالی بھی ملیں گی۔

تو صدرِ محترم! مشکلوں، صعوبتوں، دقتوں اور کٹھنائیوں کے اس وسیع سمندر میں دن کے پانچ چھ گھنٹے گزارنے اور حتی الوسع خزانۂ علم کے موتی چننے کے بعد میں فارغ ہونے پر گھر لوٹنے کے لئے تیار ہو جاتی ہوں۔ لیکن — اب تو مجھے وہی مسئلہ درپیش ہے جس نے صبح ہی صبح کالج پہنچنے سے پہلے سر ابھارا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں بوجھل دماغ اور تھکن سے چور جسم کے ساتھ کھلے آسمان تلے گھنٹوں بس کے انتظار میں سوکھنا اور کھچا کھچ بھری ہونے کے باعث رکے بغیر گزر جانے والی بسوں کی طرف حسرت سے دیکھتے رہ جانا بھی تو میرا اور مجھ جیسے بے شمار ستم رسیدوں کا "مقدر" ہے۔ آپ اسے میرا مقدر ہی کہیں گے نا! اور ہم لڑکیوں کے لئے تو یہ بھی مشکل ہے کہ بس میں خواتین کی سیٹوں پر براجمان ہو جانے والے مردوں اور خواتین والے دروازے میں لٹک جانے والے لڑکوں کی طرح ہم آدمیوں کی سیٹ اپنا لیں یا ان کے دروازے میں لٹک جائیں۔ اس کے علاوہ راہ میں آوازے کسنے والوں اور سیٹیاں بجانے والوں کی سب حرکتوں کو چپ چاپ برداشت کر لینا بھی تو ہم طالبات کا ہی حوصلہ ہے!

جی! تو یہ تھی میرے ایک تعلیمی دن کی رُوداد! لیکن راہِ تعلیم میں آنے والی مشکلات اور صعوبات صرف ایک دن پر نہیں بلکہ ماہ و سال پر محیط ہیں۔ یہ نہ صرف ہماری پوری تعلیمی زندگی ہمارا دامن تھامے رہتی ہیں بلکہ اپنے دُور رس اثرات ہماری عملی زندگی پر بھی بڑے گہرے چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میدانِ تعلیم چھوڑنے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل ہمیں بہت سے قابلیت و استعداد کے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اور حاضرینِ گرامی! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مروجہ نظامِ تعلیم میں یہ امتحانات کتنی زبردست اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہی پہ ایک طالب علم کے مستقبل اور زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہی ہم میں سے بعض کو انجنیئر، ڈاکٹر، پروفیسر، ماہرِ نفسیات اور ایسے بہت سے دوسرے معزز افراد میں ڈھال دیتے ہیں اور یہی بہت سے دوسروں کو کلرکی، ڈرائیوری یا چپڑاسی گیری کرنے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں آپ یہ کہنے کو بے تاب ہوں گے کہ ہر شخص کو اسی کی محنت کا پھل ملتا ہے جو زیادہ کاوش اور لگن سے تعلیم حاصل کرتا ہے وہ امتحانات میں سرخرو ہوتا جاتا ہے اور منزل بہ منزل آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور جو شخص اتنی محنت اور کوشش نہیں کرتا وہ اعلےٰ عہدوں کا ہرگز مستحق نہیں۔ آپ کی یہ بات درست اور آپ کی یہ دلیل بجا۔ لیکن معزز سامعین! یہ دلائل پیش کرتے وقت آپ اس اذیت ناک حقیقت کو نہ بھول جایئے گا کہ بہت سی صورتوں میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا آپ ان سفارشوں اور رشوتوں کو فراموش کر دیں گے جو ایسے [illegible] ڈال دیتے

کو فرسٹ ڈویژن میں تبدیل کر دیتی ہیں اور ایک ذہین و محنتی طالب علم سے اس کے نمبر چھین کر اس کا مستقبل تاریک کر دیتی ہیں کیا آپ اس (APPROACH) کو نظر انداز کر دیں گے جو صاحبِ حیثیت افراد کو اربابِ اقتدار تک حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے وہ اپنی ذہنی پسماندہ اور کاہل اولاد کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیتے ہیں۔

آپ کی مذکورہ بالا دلیل صحیح تھی معزز حاضرین! لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ کس کس طریقے سے کی جانے والی نقل اور (CHEATING) بعض طلبا کو اچھے نمبر دلواتی ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ امتحان رشوتوں، سفارشوں اور نقل بازی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہی فرسودہ اور غیر معیاری نظام تعلیم ہے جو برسوں سے ہمارے وطن عزیز میں رائج ہے۔ مفصل تذکرہ کی بجائے میں آپ کو صرف ایک مضمون انگریزی کی مثال دینا چاہتی ہوں جس میں ہر سال سینکڑوں طالب علم فیل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو انگریزی میڈیم سکولوں کے طالب علم اردو ادب سے خاصی حد تک نابلد ہوتے ہیں اور دوسری طرف اردو میڈیم سکولوں میں پڑھائی جانے والی انگریزی اس قدر غیر معیاری ہے کہ ان سکولوں کے طالب علم جب کالج میں پہنچتے ہیں۔ جہاں کئی مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں تو ان کی سمجھ میں سبق کا شاید دس فی صد حصہ بھی نہیں آتا۔ یہ حقیقت ہے صدرِ گرامی! کہ اردو میڈیم سکولوں کے طلبا کی انگریزی قابلِ رحم حد تک غیر معیاری ہے۔ پھر وہ (PLEASE ALLOW ME TO WENT OUT) جیسے فقرے کیوں نہ استعمال کریں! سال کے آخر میں جب ایسے طالب علموں کا امتحان لینے کی نوبت آتی ہے تو ان کی حالت شاید ایسے شاگرد کی سی ہوتی ہے جو A.B.C. تک سے تو نابلد ہو لیکن اسے ملٹن کی "جنت گم گشتہ" پر مضمون لکھنے کے لئے کہا جائے۔ ایسی صورت میں طالب علم کیوں نہ درسی کتب کی راہ مستقیم چھوڑ کر (GET THROUGH GUIDES) اور خلاصوں کے پل صراط پر چلنے کو ترجیح دے۔ ایسے ہی مظلوم طالب علم امتحانات کی تاریخیں بار بار ملتوی کروا کر، کمرۂ امتحان میں نقل کے بے شمار طریقے اپنا کر اور ممتحن کی سرزنش پر ہنگامہ کھڑا کر کے آپ کو شکایات کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان گڑبڑوں کی وجہ سے ذہین اور قابل طالب علموں کے قیمتی وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ طالب علم دل لگا کر امتحان کی تیاری کرتا ہے تو امتحان التوا میں پڑ جاتا ہے۔ یوں طالب علم ایک غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہو کر منتشر خیالی اور عدم اعتماد کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ غرض ہر طرح سے نقصان ہی نقصان ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام پر خود غرضی، بے یقینی اور مایوسی کے گہرے سائے مسلط ہو کر رہ گئے ہیں اور علم جو اقبال کے الفاظ میں فقیہہ و حکیم ہے۔ جو بانئ راہ اور مقام خبر ہے اور جس کا مقصود پاکئ عقل و خرد ہے اس کا مقصد فوت ہو کر رہ گیا ہے۔ حاضرین گرامی ان تمام حالات و واقعات کی روشنی میں جو ایک طالبۂ علم نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر آپ کے سامنے پیش کئے ہیں آپ ہی بتائیے کہ ہم طالب علم مظلوموں میں سے

ع اب ایسی شکستہ کشتی پہ ساحل کی تمنا کون کرے

۵۔ راحیل اکبر

محترم صاحبِ صدر، محترم باباجی اور حاضرین کرام! آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

میں اپنے مقالہ کا آغاز قرآن پاک کی اس آیت جلیلہ سے کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم (۱۳/۱۱)

خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے۔

قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جس قسم کی نفسیاتی کیفیت آج کے نوجوانوں کی ہوگی اسی قسم کی کل کی قوم ہوگی۔ اس لئے کہ نوجوان طالب علم تو کمہار کی مٹی یا پگھلی ہوئی دھات ہوتے ہیں اسے جس سانچے میں چاہیں، ڈھالیں۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔

برصغیر پاک و ہند میں جب انگریز نے اپنے قدم جمائے تو اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس کے تغلب و استبداد کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے ایک غیر محسوس لیکن تیر بہدف نسخہ استعمال کیا۔ اس نے کہا یہ کہ اس قوم کا نظام تعلیم بدل دیا۔ اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصے میں پوری قوم بدل گئی۔ یہ تھی قوم غالب کی سحر آفرینی جو قوم مسلم کی تبدیلی ذہنیت کا موجب بنی۔ اور یہی وہ تعلیم تھی جس نے پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

آزادی اور غلامی میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ آزاد ملک میں آپ نئی نسل کی تعلیم و تربیت اپنی مرضی سے اپنے تصورات و عقائد اور دینی اقدار کے مطابق کر سکتے ہیں لیکن غلامی میں ایسا نہیں کر سکتے۔

جب تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو چند قدامت پرست اور مذہبی پیشہ اثیت کے علمبرداروں نے اس (تحریک پاکستان) کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح روزہ، زکوٰۃ نماز اور دیگر رسوم ہی کا نام ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جب انگریز اور ہندو دونوں تمہیں مذہبی آزادی دینے کے لئے تیار نہیں تو پھر آپ پاکستان کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں۔ ان ہی کے متعلق علامہ اقبال کا ارشاد ہے کہ ؎

ملا کو جو ہے، ہند میں سجدے کی اجازت ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لیکن صاحب صدر اور حاضرین! جو لوگ آزادی اور غلامی کا وہ فرق (جو میں نے ابھی بیان کیا) سمجھتے تھے انہوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی اور پاکستان اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود عالم وجود میں آیا۔ گویا پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ اس اسلامی نظریاتی مملکت کے راہنما اصول قرآن پاک سے لینا ہیں تاکہ ان کی روشنی میں افراد کی سیرت اور کردار کی تشکیل اور معاشرے میں اجتماعی زندگی کے اسلوب وضع ہوں۔ آپ دور غلامی میں رونا روتے تھے کہ غیروں نے ہمارے نوجوانوں کو غلط تعلیم دے کر کیا کر دیا لیکن میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہاں آ کر کیا کر لیا؟ پاکستان حاصل کرنے کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہی تھا۔ آپ (ارباب اقتدار و اختیار) اور آپ (والدین) اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے آپ نے پاکستان حاصل کیا تھا لیکن آپ نے اپنے اس اہم اور مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا ہے اور آپ باقی ماندہ قوم کو بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔

قوموں کی ہلاکت سے یہی مفہوم نہیں کہ ان کی نسل سے صفحۂ ارض پر کوئی متنفس باقی نہ رہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی مخصوص تصورِ حیات نہ رہے۔ اگر تصورِ حیات ہی باقی نہ رہے تو پھر اجسام کی حفاظت ایسی ہے جیسے کسی نیام بے شمشیر کی حفاظت۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں کسی غایتِ حیات کو سامنے نہیں لایا جاتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کی زندگی ایک مسافر کی نہیں ہوتی جس کا ہر قدم اپنی منزل کی طرف اٹھتا ہے بلکہ ان کی زندگی آوارگی کی زندگی ہوتی ہے جس میں ہر چلنے والا مختلف سمتوں کی طرف چلتا ہے اور اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں؟

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک تندرست و توانا جسم کے اندر قلب صالح کی تعمیر کی جائے۔ طالب علموں کے زاویہ نگاہ میں ایک خاص تبدیلی پیدا کی جائے تاکہ وہ کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جاننے اور پھر اپنا مقام پہچاننے۔

تعلیم کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کی عملی زندگی کی تجربہ گاہ میں پورا اترے اور اس سے انسان اس قابل ہو جائے کہ نوعِ انسانی کی بہبود اور منفعت کے کاموں میں عملاً حصہ لے سکے۔

اگر تعلیم کے اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو دیکھا یہ جائے گا کہ ہمارا نظامِ تعلیم تو طلبا میں دیانت داری، کم گوئی ملنساری، ایفائے عہد جیسے روزمرہ کے اوصاف بھی پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔

اسلامی مملکت میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت نے دسویں جماعت تک تعلیم مفت کر دی ہے۔ اس کے لئے حکومت لائقِ تحسین و توصیف ہے لیکن کالجوں میں دی جانے والی تعلیم آج بھی میراثن کی داستانوں اور پریم چند کے افسانوں پر مشتمل ہے اور یہ طلبا کو باور کرانے میں ناکام رہی ہے کہ سہل انگاری منافقت، بے غیرتی، بے حمیتی، خوشامد، خود غرضی، عیب جوئی سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

ہمارا نظامِ تعلیم طلبا کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ خدا کی ملکیت ہے دنیا میدانِ عمل ہے۔ یہاں سربلندی انہیں کو ملتی ہے جو قرآن کی تعلیمات پر غور کرتے ہوئے ایک دوسرے کی نشوونما کے ذمہ دار بن جاتے ہیں۔

ہمارا نظامِ تعلیم طلبا کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے گا جو حساب کتاب کا دن ہوگا اور اس دن وہی سرخرو ہوگا جس نے اپنے تمام ارادوں کو خدا کے سامنے جھکا دیا۔ یہ آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ ہے کہ آج لوگ ناجائز کاروبار کرتے ہیں۔ رشوت لیتے ہیں اور چور بازاری کرتے ہیں۔

ہمارا نظامِ تعلیم فزکس میں ہمیں ایٹم بم بنانا تو سکھاتا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ اس کو انسانیت کی تباہی اور قوموں کی بلیک میل کے لئے استعمال نہیں کرنا اور اسے انسانیت کی ترقی کے لئے استعمال کرنا ہے تو پھر اگر اکبر الہ آبادی نے ان کالجوں کو قتل گاہوں سے تعبیر کیا ہے تو غلط نہیں کیا۔

ہمارا نظامِ تعلیم ہمیں معاشیات کی تعلیم تو دیتا ہے لیکن دین کی رو سے سرمایہ داری اور دیگر متعلقہ امور کے متعلق قرآنی فکر کو عام نہیں کرتا۔

ہمارے کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم تو دی جاتی ہے لیکن وہ بزرگانِ دین کے کارناموں اور اقوال پر ہی ختم ہو جاتی